1 ۔ حمد

حفیظ جالندھری

خلاصہ

حفیظ جالندھری کا شمار اردو کے مشہور نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ نظم حمد میں انہوں نے اللہ تعالی کی صفات کی تعریف بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے ایک حرفِ کن سے یہ کائنات تخلیق کی اور اس میں انسانوں، جانوروں اور پودوں کو پیدا کر کے رونق پیدا کر دی۔ اس کائنات کا نظام اللہ تعالی کے اختیار میں ہے۔ موسموں کا بدلنا، نعمتوں کی فراوانی، نباتات، حیوانات، سب چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالی نے اپنی مہربانی سے انسان کو نیک فطرت پر پیدا کیا اور حضرت محمد ﷺ کے نام پر نثار ہونے کا جذبہ دلوں میں پیدا کیا۔

اشعار کی تشریح

شعر 1:

اسی نے ایک حرف کُن سے پیدا کر دیا عالم
کشاکش کی صدائے ہاوہو سے بھر دیا عالم

مفہوم:

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو لفظ 'کُن' سے پیدا کر کے دنیا کو مختلف آوازوں سے بھر دیا ہے۔

تشریح:

حفیظ جالندھری اُردو کے بلند پایہ نظم گو شاعر تھے۔ زبان کی سادگی، سوز و گداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کا حمد یہ کلام عشق حقیقی سے لبریز ہے۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور حمد سرا ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کو لفظ کُن سے تخلیق کیا۔ اللہ نے فرمایا ہو جا۔ پس وہ ہو گیا۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"آسمان سے زمین تک وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے"

اللہ نے اس دنیا کو پیدا کر کے مختلف آوازوں سے بھر دیا ہے اور ہر طرف رونق اور گہما گہمی ہے۔ مختلف نظریات باہم متصادم ہیں۔ مختلف نظریات و صدائیں تکرار کر رہی ہیں۔ اور یہ سب رنگا رنگی اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

"وہ ہر چیز پر محیط ہے"

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں رونق اور گہما گہمی کے لیے انواع و اقسام کی اشیا پیدا کیں۔ طرح طرح کے حیوانات، ان کی طرح طرح کی بولیاں، بے شمار اقسام کے پرندے ان کی مختلف اقسام کی چہچہاہٹ۔ طرح طرح کے ذائقوں کے پھل اور دلکش گلہائے رنگارنگ اور ان کی مہک

پھر درختوں کے پتوں سے ٹکرا کر پیدا ہوتی ہوا کی سرسراہٹ۔ یہ سب رونق اللہ کی پیدا کردہ ہے اور انسانوں کی سہولت و ضرورت کے لیے تخلیق ہوئی ہے۔

شعر 2:

نظام آسمانی ہے اسی کی حکمرانی سے

بہار جاودانی ہے اسی کی باغبانی سے

مفہوم:

آسمان کا نظام اللہ کے حکم کے تابع ہے اور اس دنیا میں ہمیشہ رہنے والی بہار کا نگہبان بھی وہی ہے۔

تشریح:

حفیظ جالندھری اُردو کے مشہور نظم گو شاعر تھے۔ زبان کی سادگی، سوز و گداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کا حمدیہ کلام عشق حقیقی سے لبریز ہے۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور حمد سرا ہو کر کہتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ یہ آسمان کا نظام، سورج اور چاند کا اپنے وقت پر طلوع و غروب ہونا تیرے ہی حکم کے تابع ہے۔ سورۃ الرحمان میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:

"رحمان کے سوا کوئی نہیں جو انھیں تھامے ہوئے ہو۔ وہی ہر چیز پر نگہبان ہے"

شاعر کہتا ہے کہ دن رات کا بدل بدل کر آنا اور جانا تیرے ہی حکم سے ہے۔ تیری بادشاہت زمین و آسمان پر ہے اے اللہ تیری بدولت ہی اس دنیا کی ہمیشہ رہنے والی بہار ہے۔ شاعر نے اس دنیا کو ایک باغ سے تشبیہ دی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا رکھوالا ہے زمین اور آسمان میں اللہ ہی کی ہستی تمام اختیارات واقتدارات کی مالک ہے۔ خلق اسی کی ہے۔ نعمت اسی کی ہے۔ اَمر اسی کا ہے۔ اسی لیے قرآن میں ارشاد ہے:

"رات اور دن کو، چاند اور سورج کو تمھارے لیے مسخر کیا اور ستارے اسی کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں"

بقول شاعر: رنگ تیرا چمن میں بُو تیری

خوب دیکھا تو باغباں تو ہے

اللہ کی باغبانی اور پروردگی کے سبب اس دنیا میں بہار ہے۔ شاعر نے دنیا کو باغ سے تشبیہ دی ہے اور اللہ تعالیٰ کو باغ کا باغباں کہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ چوں کہ اللہ کی ذات اس باغ کی نگہبانی اور باغبانی کر رہی ہے اس لیے یہ سدا بہار کھلا ہوا چمکتا ہوا پر رونق ہے اور اس میں موسم کوئی ہی کیوں نہ ہو انسانوں چرندوں پرندوں نباتات کے سبب ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہے۔ ہر موسم کے پھل اپنے اثرات، اپنے خصائص لیے ہوئے ہیں۔ یوں یہاں ہر موسم میں بہار کی کیفیت رہتی ہے اور یہ سب اس لیے ہے کہ یہاں کا باغباں خالق کائنات ہے۔

شعر 3:

زمین پر جلوہ آرا ہیں مظاہر اس کی قدرت کے

بچھائے ہیں اسی رات نے دستر خواں نعمت کے

مفہوم:

زمین پر ہر طرف اللہ کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہی تمام مخلوقات کا رازق ہے۔

تشریح:

حفیظ جالندھری اُردو کے عظیم نظم گو شاعر تھے۔ زبان کی سادگی، سوز و گداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کا حمد یہ کلام عشق حقیقی سے لبریز ہے۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور حمد سرا ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ سب ظاہروں سے بڑھ کر ظاہر ہے کیوں کہ دنیا میں جو کچھ بھی ظہور ہے اسی کی صفات، اسی کے افعال اور اسی کے نور کا ظہور ہے۔ اس زمین پر بسنے والی ہر چیز اس بات کی گواہ ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اللہ نور السمٰوٰت والارض

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کے لیے طرح طرح کی نعمتیں اتاری ہیں۔ ان سب چیزوں سے اللہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے یہ سب نعمتیں انسانوں کے لیے پیدا کی ہیں۔ اسی نے انسان کے کھانے اور پینے کا نظام ترتیب دیا ہے۔ وہی سب کو روزی دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین والوں کے لیے اور خود تمھارے نفسوں میں بھی، کیا تم دیکھتے نہیں اور آسمانوں میں تمھاری روزی ہے"

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ضروریات اور حاجات پوری کرنے کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان گنت ہیں۔ چہار سو اس کی نعمتوں کے ذخائر ہیں۔ ہماری تخلیق، چرند، پرند، نباتات جن سے ہم طرح طرح کے فوائد حاصل کرتے ہیں، اس کے پیدا کردہ ہیں۔ بدلتے موسم مختلف ذائقوں کے لذیز پھل، مختلف رنگ و بو کے پھول، طرح طرح کا اناج، چوپائے جن سے ہم باربرداری اور گوشت و دودھ حاصل کرتے ہیں اور پُر رونق فضائیں سب اللہ کی نعمتیں ہیں جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دور جام اُس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اُس کا

شعر 4:

یہ سرد و گرم، خشک و تر، اجالا اور تاریکی
نظر آتی ہے سب میں شان اس کی ذاتِ باری کی

مفہوم:

موسموں کے تغیر و تبدل، روشنی اور اندھیرے، خشکی اور تری میں اللہ کی شان نظر آتی ہے۔

تشریح:

حفیظ جالندھری اردو کے بلند پایہ نظم گو شاعر تھے۔ زبان کی سادگی، سوز و گداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کا حمد یہ کلام عشق حقیقی سے لبریز ہے۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور حمد سرا ہو کر کہتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے میں اللہ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ سردی، گرمی، بہار، خزاں ہر خشک اور گیلی چیز، روشنی اور اندھیرے میں اسی کی نشانیاں ہیں۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جاننا چاہے تو کائنات کی ہر چیز اس ذات کے بارے میں آگاہی دے گی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یدبر الامر من السماء الی الارض

"آسمان سے زمین تک وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے"

اللہ نے مختلف موسم بنائے جو بدل بدل کر آتے اور جاتے ہیں۔ اسی طرح گردش لیل ونہار بھی اسی کے تصرف میں ہے۔ حدیثِ قدسی ہے کہ:۔

"تمام معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں ہی لیل ونہار کو گردش دیتاہوں"

دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو اس شعر میں علامتی طور پر انسان کو درپیش مختلف حالات کی طرف بھی اشارہ ہے جس کا انسان سامنا کرتا رہتا ہے۔ کبھی خوشی کبھی غم- انسانی زندگی میں اچھے بُرے حالات آتے ہیں۔ یہ سب حالات اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔

"اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے" (الحدید)

اللہ تعالیٰ تنگی وکشادگی سے اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے، کبھی دکھ دے کر کبھی خوشی دے کر کبھی اولاد کی اور کبھی دولت کی کمی بیشی سے تاکہ انسان پورا اترے اور اخروی نجات حاصل کرے۔ یوں ان سب میں اللہ کی قدرت دکھائی دیتی ہے۔

ے پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب

کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار

خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نور آفتاب

کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب

موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

شعر5:

وہی ہے کائنات اور اس کی مخلوقات کا خالق

نباتات وجمادات اور حیوانات کا خالق

مفہوم:

کائنات اور اس کی مخلوقات، پودے، درخت، معدنیات اور حیوانات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

تشریح:

حفیظ جالندھری اردو کے بلند پایہ نظم گو شاعر تھے۔ زبان کی سادگی، سوز وگداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کا حمدیہ کلام عشق حقیقی سے لبریز ہے۔ زیر تشریح شعر میں وہ خدائے بزرگ وبرتر کے حضور حمد سرا ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس ساری دنیا کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس دنیا کی تمام مخلوقات بھی اسی نے پیدا کی ہیں۔ وہ سب کا خالق ومالک ہے۔ کائنات کے تمام اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ خلق اسی کی ہے۔ نعمت اسی کی ہے۔ سورۃ الحجر میں ارشاد ہے:

"یقیناً تمھارا رب سب کا خالق ہے"

شاعر یہ کہتا ہے کہ اللہ سب کا خالق ہے۔ وہ چیز جاندار ہو یا بے جان، پہاڑ ہوں یا دریا، پودے ہوں یا درخت یا چرند پرند۔ اللہ تعالیٰ ہی سب کو پیدا کرنے والا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولہ مافی السمٰوٰت والارض کل لہ قانتون

"زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں اس کے مملوک ہیں، سب اس کے تابع فرمان ہیں"

دنیا کی ہر شے اسی کے بنانے سے بنی ہے۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی ہر ایک چیز کو اس نے وہ صورتِ خاص عطا کی ہے جو اسے کائنات میں اپنے حصّہ کا کام ٹھیک انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔

وکان اللہ بکل شیی محیط

"اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے"

اللہ تمام جہانوں اور ان میں موجود تمام فطری اشیا کا خالق ہے۔"اور یہ زمین اور آسماں باہم ملے ہوئے تھے، ہم نے انھیں جدا کر دیا، آسمان سے پانی برسایا اور ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا"(القرآن)

کائنات کی تخلیق کے بعد انواع واقسام کی مخلوقات کی تخلیق ہوئی اور پھر اشرف المخلوقات انسان کی جسے اللہ نے کھنکھناتی مٹی سے پیدا فرمایا۔ انواع واقسام کے پھل دار اور پھول دار پودے، سایہ دار درخت اور طرح طرح کے جانور جن میں بعض سے گوشت اور دودھ حاصل ہوتا ہے اور بعض سے ہم کام لیتے ہیں۔ پہاڑ اور پہاڑی وادیاں جو اپنی خوبیاں انسانوں پر عیاں کیے ہوئے ہیں، اللہ کی تخلیق ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

شعر6:

وہی خالق ہے دل کا اور دل کے نیک ارادوں کا
وہی مالک ہمارا اور ہمارے باپ دادوں کا

مفہوم:

انسان کے دل اور اس کے ارادوں کا پیدا کرنے والا اللہ تعالی ہے۔ ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا مالک وہی ہے۔

تشریح:

حفیظ جالندھری اردو کے بلند پایہ نظم گو شاعر تھے۔ زبان کی سادگی، سوز وگداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کا حمدیہ کلام عشقِ حقیقی سے لبریز ہے۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ خدائے بزرگ وبرتر کے حضور حمد سرا ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالی ہمارے ہر ارادے سے واقف ہے۔ ہمارے دلوں میں جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ اللہ تعالی کی مرضی سے ہی پیدا ہوتا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ

"اور خوب جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے"۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم دل میں کسی نیک کام کا ارادہ کریں تو جان لینا چاہیے کہ اس نیک کام کی تحریک اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ اللہ کی قدرت اور علم نے انسان کو اندر اور باہر سے گھیر رکھا ہے۔ اللہ تعالی نہ صرف ہمارا مالک ہے بلکہ ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگ بھی اسی کے بندے تھے۔ اللہ کی حاکمیت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ سورۃ بقرہ میں اسی لیے ارشاد ہے کہ:۔

"اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس رب کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں"

شعر7:

بشر کو فطرتِ اسلام پیدا کیا جس نے
محمد مصطفیؐ کے نام پر شیدا کیا جس نے

مفہوم:

اللہ نے انسان کو اسلام کی فطرت پر پیدا کر کے اس کے دل میں محمدؐ پر قربان ہونے کا جذبہ عطا کیا۔

تشریح:

حفیظؔ جالندھری اردو کے بلند پایہ نظم گو شاعر تھے۔ زبان کی سادگی، سوز و گداز اور موسیقیت ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کا حمدیہ کلام عشق حقیقی سے لبریز ہے۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور حمد سرا ہو کر کہتے ہیں کہ وہ خدائے بزرگ و برتر ہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ اسے اسلام کے اصولوں پر چلنا سکھایا۔ کائنات کے اسرار و رموز سے واقفیت دلائی۔ انسان اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا ہے اور زندگی سے لطف اٹھاتا ہے۔ اسی لیے اس نے سورۃ آل عمران میں یہ دعا سکھادی کہ:

"پروردگار جب تو ہمیں سیدھے راستے پر لگا چکا ہے تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دینا۔"

اللہ ہی ہے جو انسان کو فطرت اسلام پر پیدا کرتا ہے، کائنات کے ہر فرد کا فطری مذہب اسلام ہی ہے کیوں کہ

ان الدین عند اللہ الاسلام

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔"

اللہ تعالی نے یہ کائنات محمدؐ رسول اللہ کے لیے تخلیق کی ہے اور اللہ نے انسان کو محمد عربیؐ کا شیدائی بنایا۔ انسان آپؐ سے محبت کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ کائنات انہی کے لیے ہے۔ محمدؐ سے محبت ہی ایمان کی تکمیل اور اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے۔

یہ کائنات سرور کون و مکاںؐ کے لیے تخلیق ہوئی۔ انھیں انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ وہی جنھوں نے متضاد سرکش قبائل کو بھائی بھائی بنادیا۔ عورت کو ماں، بہن، بیوی، بیٹی کی حیثیت سے عزت دی۔ انسانوں کو انسانی غلامی سے آزادی دلائی اور نسل در نسل سود خوروں کی غلامی سے بچایا۔ جس نے یتیموں، بیواؤں اور بے کسوں کی دستگیری کی۔ اس لیے ایک عالم حضورؐ کا شیدائی ہے اور ان کے لائے ہوئے پیغام اسلام کا پیروکار ہے۔ یہ عین مشیت ایزدی ہے۔ فرمانِ خدا ہے:

"اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میرے رسولؐ کی اطاعت کرو" یہی وجہ ہے کہ انسان جو اصول فطرت کو پسند کرتا ہے دینِ فطرت لانے والے محمدؐ کا شیدائی ہے اور ان سے عشق رکھتا ہے۔ ان کا شیدا ہو کر ہی بشر دنیوی و اخروی نجات حاصل کر سکتا ہے۔

محمد کی محبت دین حق کی شرط اول ہے
اک میں ہو اگر خامی تو ایماں نامکمل ہے

مشق

1- سوالات کے مختصر جوابات

(الف) اللہ تعالی نے یہ کائنات کونسا ایک لفظ کہہ کر بنائی ہے؟

جواب: اللہ تعالی نے یہ کائنات "کُن" کہہ کر بنائی ہے۔

(ب) اللہ تعالی نے انسان کو کن نعمتوں سے نوازا ہے؟ چند ایک تحریر کیجیے؟

جواب: اللہ تعالی نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ اللہ نے ہاتھ پاؤں اور جسمانی نعمتوں کے علاوہ کھانے، پینے اور رہنے کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ پھل، اناج، زمین، آگ، پانی اور سمندر اس کی نعمتیں ہیں۔

(ج) اُجالے اندھیرے اور خشک وتر کس کے مظاہر ہیں؟

جواب: اجالے اندھیرے اور خشک وتر اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان کے مظاہر ہیں۔

(د) حمد میں خالق کی کن مخلوقات کا ذکر کیا گیا ہے؟

جواب: حمد میں نباتات، جمادات، حیوانات اور کائنات کی ہر چیز کا خالق اللہ کو کہا گیا ہے۔

(ہ) اس نظم "حمد" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

جواب: خلاصہ:

حفیظؔ جالندھری کا شمار اردو کے مشہور نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ نظم حمد میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کی تعریف بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک حرفِ کن سے یہ کائنات تخلیق کی اور اس میں انسانوں، جانوروں اور پودوں کو پیدا کر کے رونق پیدا کر دی۔ اس کائنات کا نظام اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ موسموں کا بدلنا، نعمتوں کی فراوانی، نباتات، حیوانات، سب چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے انسان کو نیک فطرت پر پیدا کیا اور حضرت محمد ﷺ کے نام پر نثار ہونے کا جذبہ دلوں میں پیدا کیا۔

2- الفاظ سے مصرعے مکمل کریں۔

1- نظام آسمانی ہے اسی کی حکمرانی سے۔

2- زمین پر جلوہ آرا ہیں مظاہر اس کی قدرت کے۔

3- وہی ہے کائنات اور اس کی مخلوقات کا خالق۔

4- بشر کو فطرت اسلام پر پیدا کیا جس نے۔

3- نظم "حمد" کے متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان لگائیں:

(الف) نظم "حمد" کس شاعر کی تخلیق ہے؟

(الف) احسان دانشؔ (ب) جمیل الدین عالیؔ (ج) ✓ حفیظ جالندھری (د) جوش ملیح آبادی

(ب) کائنات کا وجود اللہ تعالیٰ کے:

(الف) احکامات کا نتیجہ ہے (ب) چاہنے کا نتیجہ ہے (ج) ✓ حرفِ کُن کا نتیجہ ہے (د) ان سب کا

(ج) نظامِ آسمانی اور بہارِ جاودانی میں کون سی بات مشترک ہے؟

(الف) ✓ خالق ایک ہے / قافیہ ایک ہے (ب) ردیف ایک ہے

(ج) دونوں کائنات کا حصہ ہیں (د) ایک ہی نظام کے عناصر ہیں

(د) یہ عالم اللہ تعالیٰ نے کس چیز سے بھر دیا ہے؟

(الف) رنگ وبُو سے (ب) مخلوقات سے (ج) جمادات ونباتات سے (د) ✓ ان سب سے

(ہ) ذاتِ باری تعالیٰ کی شان کہاں نظر آتی ہے؟

(الف) سرد و گرم میں (ب) خشک و تر میں (ج) اُجالے اور تاریکی میں (د) ✓ ان سب میں

(و) اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتِ اسلام پر پیدا کر کے کون سا اور احسان کیا؟

(الف) رزق دیا (ب) صحت و تندرستی دی (ج) ✓ اسمِ محمد ﷺ کا شیدا کیا (د) عقل و شعور کی دولت دی

4- کالم (الف) کے الفاظ کالم (ب) سے ملائیں:

جواب:

نمبر شمار	کالم الف	کالم ب
1-	ایک حرفِ کُن	عالم کا پیدا ہونا
2-	بہارِ جاودانی	باغبانی سے
3-	بشر کا پیدا ہونا	فطرتِ اسلام
4-	کائنات	خالق
5-	بچھائے	دستر خوانِ نعمت

5- درجِ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

جواب:

نمبر شمار	الفاظ	متضاد
1-	شمس	قمر
2-	سرد	گرم
3-	تر	خشک
4-	تاریکی	اجالا
5-	خالق	مخلوق
6-	ثابت	سیارہ

6- درج ذیل الفاظ کے معانی لکھیں۔

حرفِ کُن	ہو جا (اللہ کی قوّتِ تخلیق کہ ہم کہتے ہیں "ہو جا" پس ویسا ہو جاتا ہے)
صدائے ہاو ہُو	رونق مراد ہے / مختلف آوازیں
کشاکش	کھینچا تانی / تکرار / جھڑپ / کشمکش
بہارِ جاودانی	ہمیشہ رہنے والی بہار
جلوہ آرا	سج دھج کے سامنے آنا / ظاہر ہونا
جمادات	بے جان مادی اشیاء، پتھر، دھات

بَشر انسان / آدمی

7-حمد کے مطابق الفاظ کو ترتیب دے کر مصرعے بنائیں:

(الف) قدرت، اس کی، جلوہ آرا، زمین پر، ہیں، مظاہر، کے

(ب) کا، خالق، نباتات و جمادات، حیوانات، اور

(ج) سے، نظام آسمانی، حکمرانی، اسی کی، ہے

(د) جس نے، بشر کو، پیدا کیا، فطرتِ اسلام پر

(ہ) باپ دادوں، کا، ہمارا، وہی مالک، اور، ہمارے

جواب:

(الف) زمین پر جلوہ آرا ہیں مظاہر اُس کی قدرت کے۔

(ب) نباتات و جمادات اور حیوانات کا خالق۔

(ج) نظامِ آسمانی ہے اُسی کی حکمرانی سے۔

(د) بشر کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا جس نے۔

(ہ) وہی مالک ہمارا اور ہمارے باپ دادوں کا۔

8-حمد کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

9-حمد کے ہر شعر میں ہم آواز الفاظ موجود ہیں، ان کی نشاندہی کیجیے۔

جواب:

(کر، بھر) (حکمرانی، باغبانی) (قدرت، نعمت) (تاریکی، باری کی)

(مخلوقات، حیوانات) (ارادوں، دادوں) (پیدا، شیدا)

10-درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے۔

جواب:

حَرْفِ کُنْ

جَمَادَاتْ

نَبَاتَاتْ

بَشَرْ

نِعْمَتْ

2۔ نعت

احسان دانشؔ

خلاصہ

نعت میں شاعر حضرت محمد ﷺ کی تعریف اور توصیف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضور پُر نور، شافع یوم النشور، دوعالم کے امداد گار، امین غمگسار غریبوں کی جان کا سکوں، یتیموں کے دل کا قرار، محبوب پروردگار اور پیغمبر ذی وقار بن کر آئے۔ آپ ﷺ نے وحشت و بربریت میں پڑی انسانیت کو اصولِ محبت کا پیغام دیا، جہالت کی تاریکی میں بھٹکتی انسانیت کو ہدایت کے نور سے منوّر کیا۔ زمانے کو منزل مبارک ہو، اُن کی دائمی کامیابی، ابدی فلاح اور اخروی نجات کے لئے نبی محتشم، ہم نور مجسم ﷺ ہدایت جاوداں اور مقدس قرآن لے کر آئے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالی نے دونوں جہاں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا آپ کی تشریف آوری اللہ کا ہم پر خصوصی انعام ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات رہتی دنیا تک ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی۔ آپ ﷺ کا اخلاق بے مثال ہے۔

اشعار کی تشریح

شعر 1:

دوعالم کا امداد گار آگیا ہے
امیں آگیا، غم گسار آگیا ہے

مفہوم:

دونوں جہانوں میں بنی نوع انسان کی مدد کرنے والے امانت دار اور ہمدرد رسولؐ کی آمد ہے۔

تشریح:

احسان دانش مشہور شاعر تھے۔ ان کا نعتیہ کلام عشق رسولؐ سے لبریز ہے۔ تشریح طلب شعر میں وہ رسولؐ پاک کی صفات حسنہ کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ دونوں جہانوں میں بنی نوع انسان کی مدد کرنے والے، رہبری کرنے والے امین اور ہمدرد ہیں۔ آپؐ وجۂ تخلیقِ کائنات ہیں۔ دونوں جہان اور ان میں موجود موجودات سب ان کی ذات بابرکت کے باعث وجود میں آئے۔ انھیں دونوں جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا۔

"ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا"۔ (القران)

وہ غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں کے کام آنے والے، غلاموں کو غلامی سے نجات دلانے والے اور جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکنے والوں کو سیدھی راہ دکھانے والی ہستی تھے۔ اپنے پرائے کا غم کھانے والے انسان تھے۔ ان کی آمد سے قبل انسانیت گمراہ کن جہالت کا شکار تھی۔

انھوں نے انسانیت کو فرسودہ رسموں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل وغارت، سود خوری، انسانی غلامی، بیٹیوں کو زندہ در گور کرنے اور اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کے حضور سر جھکانے سے نجات دلائی۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ وہ چرند پرند کے لیے بھی رحمت کی نوید بن کر آئے۔ انھیں صادق وامین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ کفار مکہ تک اپنی امانتیں ان کے پاس رکھتے۔ خدائی امانت ہو یا بشری امانت انھوں نے امانت داری کی بہترین مثال قائم کی۔ وہ اس جہانِ فانی میں لوگوں کی اصلاح کے لیے رہبری کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور جہان دائمی میں بھی شفاعت و بخشش کا وسیلہ بنیں گے۔

محبت کے ہوں جس نے دریا بہائے
دل ان کا بھی جیتا جو سر لینے آئے
یوں بندہ نوازی کے جوہر دکھائے
کہ خود کھائے جَو اور جواہر لٹائے
خوشی اپنی غیروں کے غم میں بھلا دی
دیا درد جس نے اسے بھی دعا دی

شعر2:

غریبوں کی جاں کو، یتیموں کے دل کو
سکوں ہو گیا، قرار آ گیا ہے

مفہوم:

رسول اکرمؐ کی آمد سے غربا و یتامیٰ کے دل وجان کو قرار حاصل ہوا ہے۔

تشریح:

احسان دانش مزدور شاعر تھے۔ ان کا نعتیہ کلام عشق رسولؐ سے لبریز ہے۔ تشریح طلب شعر میں وہ رسول پاکؐ کی بابرکت ہستی کی بدولت غربا و یتامیٰ کو سرپرستی اور حقوق حاصل ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی بعثت سے قبل غریب ظلم کی چکی میں پس رہے تھے، نسل در نسل سود کے جال میں جکڑے ہوئے تھے، گزر بسر کے لیے انسانی غلامی پر مجبور تھے، طاقتوروں کے جبر واستبداد کا شکار تھے، بنیادی انسانی حقوق سے محروم تھے اور جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ بے بس اور بے کس کا کوئی سہارا نہ تھا۔ مفلسی ایسا جرم ضعیفی تھا جو ام الخبائث کی صورت میں عیاں ہوتا۔ یتیم دھکے کھانے پر مجبور تھے۔ یتیم شفقت کا سایہ رخصت ہوتے ہی شفقت کے سائے کو ترستا۔ کھانے پہننے اور رہنے کا سامان نہ ہوتا۔ قبائلی جہاں خاندانی تفاخر عام تھا وہاں سرپرست کے مرنے سے اولاد ذلیل وخوار ہو کے رہ جاتی۔ رسول پاکؐ کی آمد سے غربا و یتامیٰ کی زندگی میں بڑا انقلاب برپا ہوا۔ مسکین کی مدد اور غریب کی دستگیری اعلیٰ وارفع نیکی قرار پائی۔ غریب اور یتیم کو حقوق ملے۔

ع سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی

انسانی نفسیات ہے کہ اہل ثروت کو معاشرے میں قدرو منزلت حاصل ہوتی ہے اور غریب یتیم کو ذلیل وتنقیص۔ لوگ رئیس سے تعلق بناتے ہیں اور مفلس سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ یہ رسول پاکؐ کی فراخ دلی، ہمدردی، غمگساری اور صفت رحمت ہے کہ غریبوں کے ملجا اور یتیموں سے محبت کرنے والے تھے۔ انھوں نے غربت سے پیدا شدہ مسائل سے لوگوں کو نجات دلائی۔ غلامی سے آزاد کروایا۔ قرض باسود کی

لعنت سے نجات دلائی اور معاشرے میں غریب کا سہارا بنے۔ تیموں کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور ان کی دستگیری کا کامل خیال رکھا۔ یوں ان کے آنے سے غربا و یتامیٰ کے دلوں کو قرار حاصل ہوا۔

شعر 3:

اصول محبت ہے پیغام جس کا
وہ محبوب پروردگار آ گیا ہے

مفہوم:

رسول اکرم اللہ کے محبوب ہیں اور ان کا پیام اصول محبت ہے۔

تشریح:

احسان دانش مزدور شاعر تھے۔ ان کا نعتیہ کلام عشق رسولؐ سے لبریز ہے۔ تشرح طلب شعر میں وہ رسول اکرمؐ کی صفت محبت کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے محبوب ترین پیغمبر ہیں اور ان کے پیغام کی بنیادی روح محبت ہے بنی نوع انسان سے محبت جانوروں اور پرندوں سے محبت، خالق کائنات اور اس کے احکامات سے محبت۔ رسول پاکؐ کی بعثت کے وقت عرب معاشرے کے قلوب حسد، بغض، نفرت اور دوسروں کا حق مارنے کے جذبات سے آلودہ تھے۔ عورت، یتیم، مسکین، بیوہ، دشمن سب کی تذلیل رواجِ زمانہ تھا۔ باہم متضاد اور متحارب قبائل چھوٹی چھوٹی باتوں پر طویل جنگ و جدل میں مصروف رہتے۔ عرب گھڑ دوڑ اور پانی پینے پلانے کے معاملے پر تمیس اور پچاس سال تک لڑتے رہے۔ بیٹیوں کو زندہ در گور کیا جاتا۔ یتیم و مسکین دھکے کھاتے۔ انسان کو مالی و جسمانی غلام بنایا جاتا۔ لیکن رسول پاکؐ کی آمد سے بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ سارا منظر نامہ ہی بدل گیا۔ عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے محبت و عزت حاصل ہوئی۔ مالی و جسمانی غلامی سے نجات حاصل ہوئی اور سب بنی نوع انسان کو برابر قرار دیا گیا۔ دشمنوں کو معافی حاصل ہوئی۔ یعنی غلاموں اور دشمنوں کے ساتھ محبت کے سلوک کے باعث ان کے جانی دشمن ان کے ہمرکاب ہو گئے۔

محبت کے یوں جس نے دریا بہائے
دل ان کا بھی جیتا جو سر لینے آئے

رسول پاکؐ مخلوق خدا سے محبت والفت رکھنے والے اور خود خدا کے محبوب ترین رسولؐ تھے۔ انہی کے نقش کی روشنی سے دونوں جہانوں کو سجایا گیا۔ وہ اپنی صفات میں سب انسانوں سے افضل تھے ان کی اتباع کو اللہ نے اپنی اتباع قرار دیا:

"اور اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو اس کی اتباع کرو جس سے اللہ محبت کرتا ہے" (القرآن)

"بے شک اللہ اور فرشتے حضرت محمدؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں، اے ایمان والو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجا کرو"

وہ خدا کے محبوب ترین تھے اور ان کے پیغام کی بنیادی روح 'محبت فاتح عالم' تھی۔

شعر 4:

اب انسان کو انسان کا عرفان ہو گا
یقین ہو گیا، اعتبار آ گیا ہے

مفہوم:

رسول پاکؐ کی آمد سے اب ہمیں یقین ہے کہ انسان کو انسان کی پہچان حاصل ہو گی۔

تشریح:

احسان دانش معروف نظم گو شاعر تھے۔ انہیں مزدور شاعر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام عشق رسولؐ سے لبریز ہے۔ تشریح طلب شعر میں شاعر احسان دانش رسول اکرمؐ کی بعثت سے برپا ہونے والے انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی آمد سے پہلے انسانوں کو انسان کے اشرف مرتبے کا عرفان حاصل نہیں تھا۔ اب رسولؐ کی آمد سے انسان کو اس کا کھویا ہوا وقار حاصل ہو گا۔ ہمیں یقین ہے کہ رسولؐ رحمت دو عالم ہیں، سید الانبیا ہیں، سب سے عظیم انسان ہیں، وہ ساری دنیا کے انسانوں کو ان کے حقوق دلوائیں گے۔ وہ ایسا نظام لے کے آئے ہیں جو بنی نوع انسان کو تذلیل سے نکال کر معزز و مکرم بنائے گا۔

بعثت رسولؐ سے قبل انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ انسان اپنی اولاد زندہ درگور کیا کرتا اور دوسرے انسان کو غلام بنا کر جانور کی طرح کام لیتا تھا، عورت کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور اسے وراثتی حق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ رنگ و نسل کا تعصب انسانوں کی تحقیر کا سبب تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس منظر نامے میں رسول پاکؐ کی آمد سے آسمانِ انسانیت پر چھائے یہ تمام جہالت کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ متضاد و متحارب قبائل باہم بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے خیر خواہ بن جائیں گے۔ مالی و جسمانی غلامی اور رنگ نسل کے تعصّبات ختم ہو جائیں گے اور مساوات کا دور دورہ ہو گا۔ عورت کو ماں، بہن، بیوی، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے حرمت اور عزت حاصل ہو گی۔ اسے وارثت میں حق دار مانا جائے گا۔ بیٹیاں زندہ درگور ہونے کی بجائے رحمت اور منزلت کا باعث مانی جائیں گی جیسا کہ رسولؐ نے کہا کہ "جس نے دو بیٹیوں کی پرورش کی وہ جنت میں میرے ساتھ ایسے ہو گا جیسے میرے ہاتھ کی پہلی دو انگلیاں"۔ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فوقیت و فضیلت حاصل نہیں ہو گی۔ یوں انسان کی قدر ہو گی۔

انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گیا ہے لیکن کچھ انسانوں نے دوسرے انسانوں کو اس رتبے سے محروم کر دیا اور تحقیر و تذلیل کا باعث بنے۔ رسولؐ کی آمد سے شاعر کو یقین و اعتبار ہے کہ اب انسان کو اس کا گم گشتہ مرتبہ حاصل ہو گا، انسان انسان کی قدر کریں گے، بھائی بھائی بن جائیں گے بلکہ جسد واحد کی طرح ہو جائیں گے اور انھیں تعلیم ملے گی کہ انسان کا درست رتبہ کیا ہے اور انسانیت کیا ہے۔ در حقیقت شاعر نے انسانی اور عمرانی اعتبار سے حضرت محمدؐ کے پورے انقلاب کو موضوعِ شعر بنایا ہے۔

شعور لایا، کتاب لایا، وہ حشر تک کا نصاب لایا
دیا بھی کامل نظام اس نے، وہ آپ ہی انقلاب لایا

شعر5:

بجھے گا نہ جس کا چراغ محبت
وہ پیغمبرؐ ذی وقار آ گیا ہے

مفہوم:

حضرت محمدؐ وہ ذی وقار پیغمبر ہیں جن کی ہدایت کی شمع ہمیشہ روشن رہے گی۔

تشریح:

احسان دانش معروف نظم گو شاعر ہیں۔ مزدور شاعر احسان دانش کا کلام عشق رسولؐ سے لبریز ہے۔ تشریح طلب شعر میں وہ بحضور سرورِ کائنات عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ ہادی عالم ہیں۔ وہ اپنے عہد سے لے کر تا قیامت آنے والے انسانوں کے راہنما ہیں۔ انھوں نے جہالت کی تاریکیوں میں ہدایت کا چراغ روشن کیا اور گمراہی کے اندھیرے ختم ہو گئے۔

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا

پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رسول پاکؐ کی تعلیمات کی برکت تھی اور ان کا فیضان تھا کہ عربوں کی معاشرتی سیاسی اور اخلاقی گمراہی شائستگی و تہذیب میں بدل گئی۔ انسانوں اور جانوروں کو ان کے حقوق ملے۔ ان کے تربیت یافتہ ہمراہیوں نے رُشد و ہدایت کی تعلیمات کو عام کیا اور سارا عالم ان سے مستفید ہوا۔ ان کا یہ فیضان رکا نہیں بلکہ اب تک جاری و ساری ہے۔

رسول پاکؐ سے پہلے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرؑ انسانوں کی راہنمائی و اصلاح کے لیے مبعوث کیے گئے۔ ان تمام انبیا ورُسُلؑ کی تعلیمات ان کے اپنے عہد کے انسانوں کے لیے تھیں۔ رسولؐ کی تعلیمات رہتی دنیا تک کی انسانیت کے لیے ہیں۔ یہ حضرت محمدؐ کی عظمت و شان ہے کہ ان کی ہدایت کا چراغ ہمیشہ روشن رہے گا اور ظلمت میں بھٹکنے والی انسانیت اس سے نور اور تابش حاصل کرتی رہے گی۔ وہ اتنے ذی وقار ہیں کہ وہ سید الانبیا اور ختم الرسُل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بے شک اے محمدؐ! ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا" (القرآن)

شعر 6:

زمانے کو اب اپنی منزل مبارک

کہ اک خضرِ صدرہ گزار آگیا ہے

مفہوم:

حضرت محمدؐ سیکڑوں راہوں کے راہنما ہیں، اہل زبان جس منزل کو حاصل کرنا چاہیں انؐ کی رہبری میں حاصل کر لیں۔

تشریح:

احسان دانش مزدور شاعر تھے۔ ان کا نعتیہ کلام عشق رسول ﷺ کے اخلاص سے لبریز ہے۔ تشریح طلب شعر میں وہ حضرت محمدؐ کے ہمہ جہت و ہمہ صفت اُسوۂ کامل کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول پاکؐ کی زندگی اہل دنیا کے لیے کامل نمونہ ہے۔ اہلِ زمانہ خواہ کسی شعبے کے مسافر کیوں نہ ہوں انھیں رہبری کے لیے حضرت محمدؐ کی زندگی میں مکمل راہنمائی ملے گی۔ کوئی باپ ہے تو فاطمہؓ کے باپ کو دیکھے شوہر ہے تو خدیجہؓ و عائشہؓ کے شوہر کو دیکھے، بھائی ہے تو حضرت حلیمہ سعدیہ کی بیٹی کے رضاعی بھائی کو دیکھے، بادشاہ ہے تو ریاست مدینہ کے والی کے اصول انتظام اور رہن سہن کو دیکھے۔ کوئی مفلس ہے تو مکے کے مہاجر اعظم کو دیکھے۔ کوئی دوست ہے تو صحابہؓ کے رفیق کو دیکھے۔ کوئی سپہ سالار ہے تو بدر و حنین کے سالارِ اعظم کو دیکھے۔ کوئی بہادر ہے تو اپنے اوپر تلوار تانے کافر کا دلیری سے سامنا کرنے والے کو دیکھے۔ کوئی مصلح ہے تو عرب معاشرے میں بالعموم اور پوری دنیا میں بالخصوص انقلاب برپا کرنے والے کی تعلیمات کا مطالعہ کرے۔ کوئی بھوکا ہے تو مدینہ کے حکمران کو دیکھے جو خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلاتا تھا۔ کوئی بردبار اور صابر بننا چاہتا ہے تو دوسروں کو اپنے عزیزوں کا خون اور قرض معاف کرنے والے کے اُسوہ کو دیکھے۔ الغرض رسول پاکؐ کی زندگی میں ہر شعبے کے ہر انسان کے لیے مکمل نمونہ موجود ہے:

"اور بے شک تمھارے لیے تمھارے رسولؐ کی زندگی بہترین نمونہ ہے" (القرآن)

اہل زمانہ جس بھی منزلِ متعینہ کے حصول کے متمنی ہوں انھیں چاہیے کہ رسول اکرم ﷺ ہادی عالمؐ کی زندگی سے راہنمائی حاصل کریں۔ انھیں مبارک ہو، یہ آسان ہے کیوں کہ ان کے پاس زندگی کی ہر راہ کا خضرِ راہ موجود ہے۔

مشق

1- سوالات کے مختصر جوابات

(الف) نعت کے پہلے شعر میں حضور ﷺ کی کون سی صفات بیان کی گئی ہیں؟

جواب: اِمداد گار، غمگسار، امین۔

(ب) دوسرے شعر کے مطابق کس کو سکون ملا ہے؟

جواب: غربا کی جان اور یتیموں کے دل کو سکون ملا ہے۔

(ج) انسان کو انسان کا عرفان ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب: انسان کو انسان کی پہچان اور قدر ہو گی اور انسانیت کا پتا چلے گا۔

(د) شاعری کے نزدیک حضور ﷺ کا پیغام کیا ہے؟

جواب: اصول محبت۔

(ہ) نعت کے آخری شعر میں خضر سے کون سی ہستی مراد ہے؟

جواب: رسول پاک ﷺ

3- متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان لگائیں۔

(الف) یہ نعت کس شاعر کی ہدیہ عقیدت ہے؟

(الف) حفیظؔ جالندھری (ب) حفیظ تائبؔ (ج) ✓ احسان دانشؔ (د) ماہرؔ القادری

(ب) متن کے مطابق محبوبِ پروردگار کا پیغام کیا ہے؟

(الف) ✓ اصولِ محبت (ب) غمگساری و غریب نوازی (ج) امانت داری (د) یہ سب ہیں

(ج) اب انسان کو کس کا عرفان حاصل ہو گا؟

(الف) خدا تعالیٰ کا (ب) انسان کا (ج) کائنات کا (د) ✓ ان سب کا

(د) زمانے کو منزل کے مبارک ہونے کی نوید کیوں دی گئی ہے؟

(الف) کامل رہنما کے آنے سے (ب) ✓ اِک خضرِ صدرہ گزار کی آمد کی وجہ سے (ج) انسان کا عرفان ہونے سے (د) کسی کی بھی نہیں

(ہ) پیغمبرِ ذی وقار کے چراغِ محبت کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟

(الف) روشن تر ہو گا (ب) ہمیشہ روشن رہے گا (ج) ✓ کبھی نہیں بجھے گا (د) یہ سب درست ہیں

3- درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔

عَالَم، سُکُوں، عِرفَان، مَحَبّت، مَنزِلُ

4- الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں۔

غم گسار، قرار، یقین، پیغام، ذی وقار

جواب:

الفاظ	جملے
غمگسار	رسول پاکؐ غم گُسار انسان تھے۔
قرار	رسول پاکؐ کے آنے سے یتیموں کے دلوں کو قرار ملا۔
یقین	مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے۔
پیغام	حضور ﷺ اللہ کا پیغام لے کر آئے۔
ذی وقار	رسول پاکؐ ذی وقار پیغمبر ہیں۔

5- درجِ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔

اصول، اعتبار، چراغ، عرفان، راہ گزار

جواب:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اصول	قاعدہ	اعتبار	بھروسا
چراغ	شمع	عرفان	پہچان
راہ گزار	راستہ عبور کروانے والا		

6- مناسب لفظ چُن کر مصرعے مکمل کریں۔

(الف) بُجھے گا نہ جس کا چراغِ محبت

(ب) سکوں ہو گیا ہے قرار آ گیا ہے

(ج) اب انساں کو انساں کا عرفان ہو گا

(د) زمانے کو اب اپنی منزل مبارک

7- نعت کے متن کو مد نظر رکھ کر کالم (الف) میں دیئے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملایئے۔

کالم (الف)	کالم (ب)
امداد گار	غم گُسار
اصول محبت	پیغام
یقیں	اعتبار
خضر	رہ گزار
انساں	عرفان

3 ۔ پروفیسر مرزا محمد سعید

شاہد احمد دہلوی

خلاصہ

شاہد احمد دہلوی اُردو ادب کے مشہور ادیب تھے۔ سبق "مرزا محمد سعید" میں انہوں نے پروفیسر مرزا محمد سعید کی شخصی خوبیوں کا خاکہ کھینچا ہے۔ مضمون کے آغاز میں مرزا محمد سعید صاحب کی خاموش وفات پر شدید دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ خود انہیں مرزا صاحب کی وفات کا تیسرے دن پتہ چلا اور وہ بھی اخبارات کے ذریعے۔ ان کی موت کی خبر ان کے سیکڑوں دوستوں کو نہ ہو سکی۔ مصنف نے مرزا صاحب کی موت کو ایک عالَم کی موت قرار دیا ہے۔ مرزا صاحب ہر کام نہایت خاموشی سے کرتے۔ وہ اپنی دلی تسکین کے لیے کام کرتے تھے فرمائش پر یا پیسوں کی خاطر نہیں۔ انہوں نے تمام عمر کام کرتے ہوئے گزار دی مگر انہیں نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ بہت سے پبلشروں نے ان کو بھاری معاوضہ دے کر ناول لکھوانا چاہا مگر وہ انہیں مجبور نہ کر سکے۔ لاہور کے ایک پبلشر نے مرزا صاحب کو اس دور میں ایک ہزار روپے کی پیشکش کی مگر منہ کی کھائی۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ اگر آپ پانچ یا دس ہزار روپے بھی دیں تب بھی میں اپنا تحقیقی کام (مذہب اور باطنیت) چھوڑ کر ناول نہیں لکھ سکتا۔ مرزا صاحب نے اپنا پہلا ناول "یاسمین" بلا معاوضہ اپنے ایک شاگرد پبلشر سے چھپوایا۔ دوسرا ناول "خواب ہستی" بھی بغیر کچھ لیے دیے چھپا۔ مرزا صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب "مذہب اور باطنیت) بھی بغیر کسی معاوضے کے چھپی اور یہ وہ کتاب ہے کہ اگر اردو کی سو بہترین کتابوں کا انتخاب کیا جائے تو یہ کتاب ان میں ضرور شامل ہو گی۔ مرزا صاحب دلی کے شریف اور متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ سر سید احمد خان اور منشی ذکا اللہ کے مکان ان کے گھر کے نزدیک تھے۔ سر سید اور منشی ذکا اللہ سے مرزا صاحب کی رشتہ داری بھی تھی۔ ان دنوں مسلمان انگریزی تعلیم کو برا جانتے تھے۔ مرزا صاحب نے گورنمنٹ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ بعد میں علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر بھی مقرر ہوئے آپ نے علامہ اقبال سے بھی اکتساب فیض کیا۔ پطرس اور تاج دونوں مرزا صاحب کے شاگرد رہے۔ پطرس تو مرزا صاحب کی عزت وا سرائے ہند سے بھی بڑھ کر کرتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں جب پطرس نے ایک ادبی حلقہ تشکیل دیا جس کا ماہانہ جلسہ پطرس یا ڈاکٹر تاثیر کے گھر ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اسی طرح کے ایک جلسے میں مرزا صاحب نے ایک ادبی مقالے پر اپنی محتاط رائے دی۔ پطرس نے شوخی سے کام لے کر فیض کو اشارہ کیا جو مرزا صاحب کی بات کاٹ کر بولنے لگے اس پر مرزا صاحب اس قدر جلال میں آئے کہ فیض دم بخود رہ گئے اور ان پر مرزا کی علمیت کا اس دن جوہر کھلا۔ پطرس نے چائے کا سامان رکھوا کر معاملہ ختم کیا۔ مرزا صاحب کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ گھنٹوں مطالعہ کرتے اور آپ کی پنشن کا بڑا حصہ کتب کی خریداری پر صرف ہوتا۔ آپ کی اولاد بہت سعادت مند اور بیوی بھی بہت سلیقہ شعار تھیں۔ آپ کی بیگم عمدہ ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان کے دو ایک ناول بھی چھپ چکے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل آپ صوبائی مسلم لیگ کے صدر بھی بنے۔ کراچی یونیورسٹی کے مشیر بھی رہے اور 1959ء میں پاکستانی ادیبوں کے گلڈ کی صدارت بھی کی۔ چالیس برس کی عمر میں آپ کے ہاتھوں میں رعشہ بھی آ گیا تھا جس کی وجہ سے لکھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آپ بہت خوش اخلاق، خوش مزاج اور خوش لباس شخص ہے۔ دوست کم ہی بناتے تھے کیونکہ آپ کا نظریہ تھا

آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ موت برحق ہے لیکن مرزا صاحب کی وفات کا صدمہ اس لیے زیادہ ہے کہ ایسے قابل اور عظیم لوگ زمانے میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ پروفیسر مرزا محمد سعید کا آج سوئم ہے۔ خاموش زندگی! خاموش موت! مرزا صاحب کی علالتِ مزاج یا مرض الموت کی اطلاع! اس سے پہلے نہیں ملی۔ حد یہ کہ پرسوں وہ رحلت فرما گئے اور ان کے سیکڑوں دوستوں اور قدردانوں کو اس سانحۂ اِرتحال کی خبر تک نہ ہو سکی۔

سبق کا عنوان: مرزا محمد سعید **مصنف کا نام:** شاہد احمد دہلوی

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
علالتِ مزاج	طبیعت کی خرابی، بیماری	قدردانوں	عزت کرنے والوں
مرض الموت	ایسی بیماری جس سے موت واقع ہو جائے	رحلت	وفات پانا

سیاق وسباق:

ایک عالم کی موت ساری دنیا کی موت ہے کیوں کہ صاحب کمال لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے اور ایسے لوگوں کی موت بلاشبہ المیہ ہوتی ہے پروفیسر مرزا محمد سعید نابغۂ روزگار شخصیت تھے اُن کی خاموش موت بہت بڑا سانحہ ہے۔ وہ انتہائی شریف، نڈر جامع العلوم اور قناعت پسند شخصیت تھے لالچ اُن کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر کام کرتے رہے ان کے علمی وادبی کمالات اور تحقیقی و تخلیقی عظمت کا اعتراف سبھی کرتے۔ ان کی بے پناہ علمی وادبی کاوشوں میں سے ان کے تحریر کردہ ناول اور معرکتہ الآرا کتاب "مذہب اور باطنیت" ہی انکا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

تشریح:

اس سبق میں مصنف نے پروفیسر مرزا محمد سعید کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو نہایت ہی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے تشریح طلب اقتباس سبق کے ابتدائی حصے سے لیا گیا ہے مصنف کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر بڑا ہی حیران اور رنجیدہ ہوا کہ مرزا صاحب جیسا جید عالم اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مرزا صاحب کی وفات سے ہمیں کتنا نقصان ہوا ہے۔ مرزا صاحب انتہائی خاموشی سے بہت ہی اہم کام کرنے والوں میں سے ایک تھے مرزا صاحب کبھی بھی یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ اُن کی تعریف کریں اور ہر کام انعام سے لاپرواہو کر کیا۔ مرزا صاحب نے دو ناول "یاسمین" اور "خوابِ ہستی" لکھے اس کے علاوہ اپنی معرکتہ الآرا کتاب "مذہب اور باطنیت" بھی لکھی۔

مصنف شاہد احمد دہلوی اس مضمون میں مرزا محمد سعید کی خاموش وفات پر شدید دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ خود انہیں جب پتہ چلا یعنی مرزا کی موت کی اخبارات کے ذریعے اطلاع ملی اور سیکڑوں دوستوں کو اطلاع نہ ہو سکی۔ مصنف نے ایک عالم کی موت کو اس لیے ایک عالم یعنی دنیا کی موت قرار دیا ہے عالم سے انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہے کیوں کہ آج کے دور میں عالم بہت کم پیدا ہوتے ہیں اور انسان کے لیے بہت کم کام کرتے

ہیں اس مضمون میں مصنف نے مرزا محمد سعید کی شخصی خوبیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے وہ انعام کی لالچ کے بغیر خاموشی سے کام کرنا پسند کرتے تھے۔ شہرت کو پسند نہیں کرتے۔ تمام عمر کام کرتے ہوئے گزار دی ایسے عالم صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

زمانے کے اکثر لوگ اُن کے علمی و ادبی کارناموں سے واقف نہیں تھے فرمائشی کام انھوں نے ساری عمر نہیں کیے۔ ساری عمر اپنی تسکین کے لیے کام کیے تھے حالانکہ بڑے عالموں اور ادیبوں کی یہ اولین خواہش ہوتی ہے کہ وہ لوگوں میں اپنی شہرت کی وجہ سے پہچانے جائیں پروفیسر اُن لوگوں میں نہیں تھے جو شہرت یا انعام اور معاوضے کی خاطر کوئی کام کریں اور اگر دیکھا جائے تو شریف آدمی کے لیے چھوٹا سا انعام بھی بہت ہے۔ اگر کوئی پیسوں کے لیے کوئی کام کہتا تو شدید ناراض ہوتے اور انھیں منانا مشکل ہو جاتا۔ انھوں نے ساری عمر صرف اپنے ادبی لگاؤ کی وجہ سے کام کیا۔ انھوں نے کبھی سفارشی کاموں کو اہمیت نہ دی۔ مصنف یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اتنے بڑے بااصول اور محنتی، قابل عالم کی موت کی اطلاع اُس کے تمام چاہنے والوں اور قدر دانوں کو ہونی چاہیے تھی۔ یہ اتنا بڑا حادثہ ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے چالیس برس کی عمر میں آپ کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا جس کی وجہ سے لکھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آپ بہت خوش اخلاق، خوش مزاج اور خوش لباس شخص تھے۔ آپ دوست کم ہی بناتے تھے کیوں کہ آپ کے نظریے کے مطابق آپ بھلے آپ کا گھر بھلا۔ موت برحق ہے لیکن مرزا صاحب کی وفات کا صدمہ اس لیے زیادہ ہے کہ ایسے قابل اور عظیم لوگ زمانے میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں اور اُن کی قدر اُن کے مرنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

اقتباس2:

عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔ ابھی ہم کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب کے رخصت ہو جانے سے ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اب ان کی عدم موجودگی رہ رہ کر ہمیں ان کی یاد دلائے گی اور وقت کے ساتھ اُن کی جدائی کا گھاؤ بڑھتا چلا جائے گا۔ مرزا صاحب بہت ہی خاموش کام کرنے والوں میں سے تھے، یعنی اتنے خاموش کہ خود اُن کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوئے۔ دراصل خود مرزا صاحب شہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فارم پر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کام کرتے تھے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر۔ کام کرتے تھے اپنی تسکین کے لیے۔ کام کرتے تھے اس لیے کہ انھیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائشی کام انھوں نے ساری عمر نہیں کیے۔

سبق کا عنوان: پروفیسر مرزا محمد سعید **مصنف کا نام:** شاہد احمد دہلوی

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
عالِم	علم رکھنے والا	عالَم	دنیا
گھاؤ	زخم	پبلک	عوام، لوگ

تشریح:

اس سبق میں مصنف نے پروفیسر مرزا محمد سعید کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو نہایت ہی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ تشریح طلب اقتباس سبق کے ابتدائی حصے سے لیا گیا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر بڑا حیران اور رنجیدہ ہوا کہ مرزا صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مرزا صاحب کی وفات کی خبر ان کے دوستوں اور قدر دانوں تک بھی نہ پہنچی۔ ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مرزا صاحب کی وفات سے ہمیں کتنا نقصان

ہوا ہے۔ اکثر پبلشروں نے مرزا صاحب سے کتابیں لکھوانے کے لیے بڑی بڑی رقموں کی پیشکش کی۔ مگر مرزا صاحب نے ان کو ایک لفظ بھی لکھ کر نہ دیا اور کہا کہ مجھے منظور نہیں کہ جو کام کر رہا ہوں اسے چھوڑ کر آپ کے لیے ناول لکھوں۔

شاہد احد دہلوی بیان کرتے ہیں کہ ایک پڑھے لکھے انسان کی موت پوری دنیا کی موت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کی موت سے دنیا والوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ اس شخص کے علم و فضل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کے مرنے کے بعد ہم نے بہت زیادہ نقصان اٹھایا ہے۔ مگر فی الوقت ہم اس نقصان کا انداز نہیں کر سکتے۔ ان کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کی غیر موجودگی میں ہمیں ان کی بہت یاد آئے گی۔ اور گزرتا ہوا وقت بھی ان کی جدائی کا زخم کبھی نہیں بھر سکے گا۔ بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی جدائی کا زخم شدید گہرا ہوتا جائے گا۔ مرزا صاحب بہت ہی خاموش کام کرنے والوں میں سے تھے۔ اور اپنے کام کے بارے میں کسی سے بات چیت نہ کرتے۔ یعنی خاموشی سے کام ہوتا تھا۔ ان کے زمانے کے جانے والے اور دوست حضرات بھی آپ کے علمی و ادبی کاموں سے آگاہی نہیں رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا صاحب کو یہ پسند نہیں تھا کہ لوگ میری شہرت کی وجہ سے قدر کریں۔ ہمیشہ اس شہرت سے ڈرتے ہی رہے۔ نہ ہی عوامی پلیٹ فارم پر آنے کو پسند فرمایا۔ ان کی یہ کبھی بھی خواہش نہ رہی کہ وہ لوگوں میں اپنی شہرت کے باعث پہچانے جائیں حالانکہ اکثر بڑے بڑے عالموں اور ادیبوں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی ہر طرف شہرت ہو اور لوگ ہمیشہ ان کے کارناموں پر واہ واہ کرتے رہیں۔ لیکن پروفیسر مرزا محمد سعید اس چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مرزا صاحب یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کی تعریف کریں اور نہ اپنے کام کے لیے لالچ اختیار کی۔ بلکہ ہر کام انعام سے لاپرواہو کر کیا۔ پروفیسر صاحب ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو شہرت یا انعام کی خاطر کوئی کام کرتے تھے اور اگر دیکھا جائے تو شریف آدمی کے لیے کوئی انعام کافی کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی پیسے کا ذکر بھی کرتا تو ناراض ہو جاتے اور انھیں منانا مشکل ہو جاتا تھا۔ انھوں نے ساری عمر کام صرف اور صرف اپنے ادبی لگاؤ کی وجہ سے کیا۔ اور صرف اسی کام کی طرف توجہ دیتے تھے جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ مرزا صاحب نے کبھی بھی سفارشی کاموں کو اہمیت نہ دی اور ہمیشہ ایسے کاموں کو ناپسند کیا۔

اقتباس 3:

مرزا صاحب دلّی کے شرفا کے ایک متموّل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تراہا بیرم خان سے آگے بڑھ کر ایک راستہ سیدھے ہاتھ کو مڑ جاتا ہے، اسی کے نکّڑ پر مرزا صاحب کا آبائی مکان تھا۔ اسی علاقے میں سر سید احمد خاں کا قدیم مکان بھی تھا۔ سر سید سے بھی مرزا صاحب کی عزیز داری تھی، اور منشی ذکاء اللہ سے بھی ان کی قرابت داری ہو گئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال پہلے دلّی کے مسلمان شُرفا میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا، مگر سر سید نے مسلمانوں کے اس غلط نظریے کی بہت کچھ اصلاح کر دی تھی۔ اسی زمانے میں دلّی کے دو نوجوانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی۔ ایک پروفیسر مشتاق احمد زاہدی تھے اور دوسرے پروفیسر مرزا محمد سعید۔

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
متمول	دولت مند	آبائی	باپ دادا کا
شرفا	شریف لوگ	چشم و چراغ	اولاد، بیٹے

تشریح:

اس سبق میں مصنف نے پروفیسر مرزا محمد سعید کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو نہایت ہی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ تشریح طلب اقتباس سبق کے ابتدائی حصے سے لیا گیا ہے۔

مرزا صاحب دلی کے رہنے والے شریف لوگوں میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور ان کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ تراہا بیرم خان سے آگے جا کر دائیں ہاتھ مڑ کر اس راستے کی نکڑ پر مرزا صاحب کے آباؤاجداد کا ایک مکان تھا۔ اسی جگہ پر سرسید احمد خان کا بھی پرانا گھر تھا۔ سرسید احمد خان سے بھی مرزا صاحب کی رشتہ داری تھی۔ اور منشی ذکاءاللہ بھی ان کے رشتہ دار تھے۔ تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے دلی کے شریف وبزرگ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ ابتدا میں انگریزی تعلیم کے جتنے سکول کھولے گئے وہ عیسائی مشنریوں نے کھولے۔ جہاں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ بھی کی جاتی تھی۔ جس کے لیے مسلمان کسی بھی صورت میں تیار نہیں تھے۔ ان حالات میں سرسید احمد خان آگے آئے اور انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لیے وقف کر دیا اور اس غلط فہمی کو بہت حد تک دور کر دیا اور بتایا کہ جب تک مسلمان انگریزی تعلیم حاصل نہیں کریں گے، وہ زندگی کی دوڑ میں دوسری قوموں سے آگے نہیں نکل سکتے۔ اسی دور میں دلی میں رہنے والی دو شخصیات نے اعلی تعلیم حاصل کر کے علمی دنیا میں بہت شہرت حاصل کی۔ اور وہ دو شخصیات ہیں پروفیسر مشتاق احمد زاہدی اور پروفیسر مرزا محمد سعید۔ شاہد احمد دہلوی چوں کہ خود بھی دہلی کے رہنے والے تھے انھیں وہاں کے گلی محلوں کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کون کہاں رہتا ہے چنانچہ تشریح طلب اقتباس سے ہمیں پروفیسر مرزا محمد سعید کی دہلی میں رہائش گاہ کے محل وقوع کے بارے میں علم ہوتا ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ گردونواح میں کون کون رہتا تھا اور ان کی آپس میں کیا رشتہ داری تھی ظاہر ہے کہ کسی بھی فرد کی شخصیت کی تشکیل میں اس کے گردوپیش کا ماحول اہم کردار ادا کرتا ہے پھر اس کا خاندانی پس منظر خاص اہمیت رکھتا ہے مرزا محمد سعید جس محلے میں رہتے تھے وہاں اپنے زمانے کے نابغہ روزگار افراد رہائش پذیر تھے اور پھر سرسید کے ساتھ رشتہ داری ان کے خاندان کی روشن خیالی کی دلیل ہے۔

مشق

1- سوالات کے مختصر جوابات

(الف) مرزا محمد سعید کس لیے لکھتے تھے؟

جواب: ذاتی تسکین کے لیے لکھتے تھے، کام اس لیے کرتے تھے کہ انھیں کام کرنا ہوتا تھا۔

(ب) لاہور کے پبلشروں کے ساتھ مرزا صاحب کا رویہ کیسا تھا؟

جواب: مرزا صاحب انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔

(ج) مرزا صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب کا نام اور مرتبہ بیان کیجیے۔

جواب: مذہب اور باطنیت۔ اگر اردو کی سو عمدہ کتابیں منتخب کی جائیں تو اس کتاب کو ان میں شامل کرنا پڑے گا۔

(د) مرزا صاحب کی کن دو قومی شخصیات سے عزیز داری تھی؟

جواب: سرسید اور منشی ذکاءاللہ۔

(ہ) مرزا صاحب نے کس کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے؟

جواب: سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔

(و) مرزا صاحب کا سب سے بڑا مشغلہ کیا تھا؟

جواب: مطالعہ کتب ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔

(ز) مصنف کے پروگرام، دانش کدہ، میں شرکت کی درخواست پر مرزا صاحب نے کیا جواب دیا؟

جواب: مرزا صاحب نے فرمایا: "آدمی شہرت کے لئے کوئی کام کرتا ہے یا دولت کے لیے۔ مجھے نہ اِس کی ضرورت ہے، نہ اُس کی"۔

(ح) مرزا محمد سعید کا حلیہ بیان کیجیے؟

جواب: اکہرا ڈیل، اُجلا رنگ، کُشادہ پیشانی، گھنی بھنوؤں کے سائے میں بڑی بڑی روشن آنکھیں، رُخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی، کترواں مونچھیں، ہنستے تو سامنے کے دو چار دانت ٹوٹے ہوئے نظر آ جاتے مگر بُرے نہ لگتے تھے۔ داڑھی مُنڈی ہوئی۔ دھان پان سے آدمی تھے۔

(ط) مرزا صاحب کے دونوں ناولوں کے نام تحریر کریں؟

جواب: یاسمین، خوابِ ہستی۔

2- پطرس بخاری سے مرزا صاحب کے تعلق کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

جواب: پطرس نے مرزا صاحب سے اکتساب علم کیا۔ بعد میں پطرس خود انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے مگر اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے باوجود مرزا صاحب کی عِلمیت کے آگے اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے۔

3- "عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے"۔ اس جملے کا مفہوم وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔

جواب: عالم و فاضل کی وفات اک عہد کی موت ہوتی ہے اس سے پورا عہد متاثر ہوتا ہے۔

4- متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان لگائیں۔

(الف) سبق "مرزا محمد سعید" کس ادیب کی تحریر ہے؟

(الف) نذیر احمد دہلوی (ب) ✓ شاہد احمد دہلوی (ج) اشرف صبوحی (د) مولوی عبد الحق

(ب) مرزا محمد سعید کی عزیز داری کس شخصیت سے تھی؟

(الف) ✓ سر سید احمد خاں (ب) شیخ عبد القادر (ج) شاہد احمد دہلوی (د) مشتاق احمد زاہدی

(ج) مرزا محمد سعید کے بقول انسان کس لیے کام کرتا ہے؟

(الف) شہرت (ب) دولت (ج) عزت اور وقار (د) ✓ شہرت اور دولت

(د) مرزا محمد سعید نے گورنمنٹ کالج لاہور سے کون سی سند لی؟

(الف) بی۔اے (ب) ایم۔اے تاریخ (ج) ✓ ایم۔اے انگریزی ادب (د) ایم۔اے اردو ادب

(ہ) محمود نظامی کے مقالے کے بعد مرزا محمد سعید پر کس نے تنقید کی؟

(الف) ڈاکٹر تاثیر (ب) پطرس بخاری (ج) ✓ فیض احمد فیض (د) حمید احمد خاں

(و) پروگرام "دانش کدہ" میں کتنے دانشور بلائے جاتے تھے؟

(الف) ✓ چار (ب) تین (ج) دو (د) سات

(ز) مرزا صاحب پنشن کا بڑا حصہ صرف کر دیتے تھے:

(الف) جائیداد خریدنے پر (ب) خیرات کرنے میں (ج) ✓ کتابوں پر (د) کھانے پینے پر

5- درج ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت جملوں میں استعمال کے ذریعے کیجیے:

الفاظ	جملے
سانحہ ارتحال	مجھے اس کے سانحہ ارتحال کی خبر دیر سے ملی۔
سُناونی	اس کی موت کی سناؤنی بڑی دیر بعد ملی۔
ایکا ایکی	ایکا ایکی بارش ہونے لگی۔
بے مُزد	میں نے اپنا ناول بے مُزد ہی چھپنے کے لیے دے دیا۔
متموّل	مرزا صاحب متموّل خاندان کے فرد تھے۔
قرابت داری	مرزا صاحب کی سرسید سے قرابت داری تھی۔
ہیچ سمجھنا	میں روپیہ انسانی عظمت کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں۔
شُدہ شُدہ	شدہ شدہ بات پطرس تک پہنچی۔
کرّوفر	افسر بڑے کرّوفر سے علاقے کی نگرانی کے لئے پہنچا۔
قلبِ مطمئنّہ	اللہ سب کو قلبِ مطمئنّہ کی دولت سے مالا مال کرے۔
عرضِ مدعا	پرنسپل نے عرضِ مدعا سن کر منظوری دے دی۔
متبسّم	مرزا صاحب عرضِ مدعا سن کر متبسّم ہوئے۔
رعشہ	غالب کے ہاتھوں میں رعشہ اتر آیا تھا۔
جامعُ العلوم	مرزا صاحب جامعُ العلوم ہستی تھے۔

6- اعراب لگا کر تلفظ کی وضاحت کریں۔

جوابات:

مُتَمَوِّلْ

شِعَار

اِرْتِحَالْ

قُدْرِی

سَاکِتْ

مُبَاحَثَے

مُتَبَسِّمْ

رُعْشَہ

7- سبق "مرزا محمد سعید" کا متن ذہن میں رکھ کر درست یا غلط پر نشان لگائیں۔

(الف)	مرزا محمد سعید کی موت کی خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا۔	درست ✓ / غلط
(ب)	مرزا صاحب پبلک پلیٹ فارم پر آنے سے گھبراتے نہیں تھے۔	درست / غلط ✓
(ج)	مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔	درست ✓ / غلط
(د)	مرزا صاحب جو کہہ دیتے اس سے کبھی نہ پھرتے۔	درست ✓ / غلط
(ہ)	مرزا محمد سعید دل کے مریض تھے۔	دوست / غلط ✓

4۔ نظریہ پاکستان

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

خلاصہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مشہور مضمون نگار اور اُستاد تھے۔ سبق نظریہ پاکستان میں اُنہوں نے قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔

مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری کو ہمیشہ اپنا شیوہ بنایا ہے لیکن جب کفر غلبہ حاصل کرنا چاہے تم مسلمان ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مسلم فرماں رواؤں نے ہمیشہ رواداری کا مظاہرہ کیا۔ جلال الدین اکبر اس فکر میں حد اعتدال سے بھی آگے نکل گیا۔ اُس کی ہندوؤں کی بے جا ناز برادری نے مسلمانوں کی دینی معاملات میں آزادی ختم کر دی۔ چنانچہ سب سے پہلے صدائے احتجاج شیخ احمدؒ سرہندی المعروف مجدد الف ثانیؒ نے بلند کی۔ انہوں نے اکبر اور جہانگیر کو ان کی غلط روایات پر ٹوکا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بعد میں آنے والے بادشاہ شاہ جہاں اور اورنگزیب عالمگیرؒ دینی و ملی تڑپ سے سرشار تھے۔ اورنگزیبؒ نے اپنی سی بھرپور سعی کی مگر اس کی وفات (1707ء) کے بعد بد قسمتی سے جو لوگ تخت نشین ہوئے وہ تن آسان اور عیش و مستی کے دلدادہ تھے نتیجہ یہ کہ مسلم اقتدار کی کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ صورت حال کی اصلاح کے لیے نواب سراج الدولہ، نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے جان تک کی بازی لگانے سے گریز نہ کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کی تحریک شروع کی۔ شاہ اسماعیلؒ اور سید احمد بریلویؒ نے آزادی کے لئے جانیں قربان کر دیں۔ مگر اب صورت حال نہایت خراب ہو چکی تھی۔ انگریزی اقتدار کے منحوس سائے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لیتے چلے جا رہے تھے ایسے میں سرسید نے وقت کے تقاضے کو محسوس کیا اور مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کی تلقین کی تاکہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں کے بچھائے ہوئے جال سے بچ سکیں۔ 1885ء میں کانگریس کا قیام اسی مسلم دشمن سلسلے کی کڑی تھا۔ مسلمانوں نے سرسید کے زیر اثر سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے مکمل لاتعلقی اختیار کی حتیٰ کہ انہوں نے 1906ء میں "مسلم لیگ" کے نام سے خود اپنی سیاسی جماعت قائم نہ کر لی۔ سرسید کی تحریک سے وابستہ افراد اس میں پیش پیش تھے۔ اب تک یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ ہندو انگریز گٹھ جوڑ نیک فال نہیں، مسلم دشمنی ان میں قدر مشترک ہے چنانچہ انہیں ہر طرح سے چوکنا رہنا ہو گا۔ 1911ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ، 1919ء کی تحریک خلافت، شدھی، سنگھٹن تحریک اور 1928ء کی نہرو رپورٹ یہ وہ واقعات تھے جنہوں نے ہندو ذہنیت کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ دوسری طرف پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کے (خلاف وعدہ) حصے بخرے کرنا، انگریز ذہنیت کا عکاس تھا۔ اس سب سے مسلمانوں نے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ انگریز اقتدار کی چھتر چھاؤں اور ہندوؤں کی معیت سے کبھی خیر بر آمد نہیں ہو سکتا۔ 1929ء میں قائد اعظم کے 14 نکات اور 1930ء کا علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد، یہ مسلم قیادت کے بدلے ہوئے لہجے کے غماز تھے۔ 1937ء کے انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی کانگرسی حکومتوں کا چہرہ بے نقاب ہو گیا جو مسلمانوں کو 23 مارچ 1940ء میں "قیام پاکستان" کو اپنی منزل ٹھہرانے کا محرک بنا۔ مسلمانوں کی قومیت ایک نظریاتی قومیت ہے جو لا الہ الا اللہ پر قائم ہے۔ برصغیر کے مسلمان مختلف رنگوں، نسلوں اور جغرافیائی خطوں کے تھے لیکن ایک قوم تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں کی سات سال کی شبانہ روز محنت رنگ لائی اور 14 اگست 1947ء کو وطن عزیز وجود میں آیا۔ قیام پاکستان کا مقصد فقط ایک خطہ ارضی کا حصول نہ تھا بلکہ اس کے

پیچھے کار فرما" نظریہ "کا مقصد ایک اسلامی اور فلاحی مملکت کا قیام تھا جو بد قسمتی سے اب تک حاصل نہیں ہو سکا۔ اس کا حصول صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو اور گروہ بندی پر یکجہتی کو ترجیح دیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے قول و فعل کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں اور اپنے ملک کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ ہندوؤں کو بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ مملکت قائم نہ ہونے پائے۔ ان کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ جنوبی ایشیا میں ان کی اکثریت تھی لیکن چوں کہ قیام پاکستان کا مطالبہ حق اور انصاف پر مبنی تھا اس لیے حکومت برطانیہ کو مجبور ہونا پڑا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کی پر خلوص قیادت، مسلمانوں کے یقین، اتحاد اور عملِ پیہم کی وجہ سے 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔

سبق کا عنوان: نظریۂ پاکستان **مصنف کا نام:** ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
عملِ پیہم	مسلسل کام لگاتار کام	معرضِ وجود	بننا/ ظاہر ہونا
ناگوار	بُرا، ناقابلِ برداشت	انصاف	عدل

سیاق وسباق:

اس سبق میں مصنف نے قیام پاکستان کے نظریے اور تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ رواداری مسلمان کا شیوہ لیکن کفر کا مقابلہ دلیری سے کرتا ہے۔ اکبری اور جہانگیری دور میں مجدد الف ثانیؒ نے دین کا احیاء کیا۔ مغلوں کے باہمی نفاق کے باعث انگریز غالب آگئے۔ مسلمان 1831ء اور 1857ء کی جنگیں ہار گئے تو سر سید نے قوم کو سنبھالا۔ کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ہندوؤں کی طویل چیرہ دستیوں سے مسلمانوں کو الگ ریاست کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔ نظریہ پاکستان کا مقصد پاکستان کو اسلامی اور فلاحی ریاست بنانا ہے۔ قیام پاکستان کا مطالبہ حق اور انصاف پر مبنی تھا چنانچہ 14 اگست 1947ء کو پاکستان بن گیا، ہمیں اسے عظیم بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

تشریح:

ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان مشہور محقق اور استاد تھے۔ تشریح طلب اقتباس میں وہ تاریخ پاکستان کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندو چوں کہ مسلمانوں کو محکوم بنا کر رکھنا چاہتے تھے اور ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے اس لیے پاکستان کے قیام کا مطالبہ ہندوؤں کو بہت ناگوار گزرا لیکن ان کے ہر قسم کے حربے ناکام ہوئے۔ ہندوؤں کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ اعلیٰ کاروباروں پر ان کا قبضہ تھا اور وہ بڑے سیاسی وانتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی ایشیا میں وہ زیادہ تعداد میں تھے۔ پاکستان کا قیام مسلمانوں کا حق تھا۔ مسلمان الگ تہذیب و تمدن اور رسم و رواج رکھنے کے باعث الگ ملک میں آزادی سے رہنے کے مطالبے میں حق بجانب تھے اس لیے انگریزوں کو مجبوراً ان کے مطالبے کو ماننا

پڑا۔ اس طرح قائد اعظم کی ان تھک محنت، لاکھوں لوگوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور پاکستان قائد اعظم کی مخلصانہ رہنمائی اور مسلمانوں کے ایمان، اتفاق اور مسلسل کوشش کے باعث 14 اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آ گیا۔ اگر ہم ہندوستان کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان پر جس قوم نے بھی حملہ کیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب نے اسے اپنے ساتھ یوں ضم کر لیا کہ اس قوم کی پہچان اس کی شناخت مٹ گئی۔ مسلمان واحد قوم تھی جس نے صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ اکٹھا رہنے کے باوجود اپنی پہچان برقرار رکھی۔ یہ بات ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی چنانچہ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمان اپنے لیے الگ مملکت حاصل نہ کر سکیں لیکن قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ہندوؤں کے مذموم عزائم ناکام ہوئے۔ برصغیر کی نہ صرف تاریخ تبدیل ہوئی بلکہ اس کا جغرافیہ بھی بدل گیا۔ قائد اعظم کے دیے ہوئے تین اصول یقین، اتحاد اور عمل پیہم جدوجہد آزادی میں مشعلِ راہ بن گئے اور آخر کار برصغیر کے مسلمان دنیا میں پہلی نظریاتی مملکت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔

اقتباس2:

پاکستان نے اپنے قیام سے اب تک بڑی ترقی کی ہے۔ اور اس کا شمار دُنیا کے اہم ملکوں میں ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان اور زیادہ ترقی کرے اور ہمیشہ ترقی کرے تو ہمیں نظریۂ پاکستان کو ہر وقت پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ اس کی بدولت ہم پاکستان کو زیادہ مستحکم اور شاندار بنا سکتے ہیں۔

سبق کا عنوان: نظریۂ پاکستان **مصنف کا نام:** ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
پیش نظر	سامنے رکھنا	مستحکم	مضبوط
شاندار	شان و شوکت والا	شمار ہونا	گنتی ہونا، گنا جانا

تشریح:

تشریح طلب اقتباس ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے سبق "نظریہ پاکستان" کے آخر سے لیا گیا ہے اور مصنف نے ہمیں بتایا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں صدیوں اکٹھے رہنے کے باوجود مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں اپنی الگ پہچان رکھتے چلے آئے ہیں۔ مسلمانوں کی یہی انفرادیت قومی نظریے کی بنیاد بنی اور اس پر نظریہ پاکستان تشکیل پایا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنا الگ ملک پاکستان حاصل کیا۔ پاکستان کے حصول کے لیے ہمارے باپ دادا نے بہت زیادہ قربانیاں دیں۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستانیوں کی محنت سے پاکستان نے ہر شعبہ میں بہت ترقی کی ہے۔ زرعی، معاشی، صنعتی، دفائی، تعلیمی اور کھیلوں کے اعتبار سے پاکستان کا شمار اہم ممالک میں ہوتا ہے۔ پاکستان چھٹی بڑی ایٹمی طاقت ہے۔ دفائی ساز و سامان، ٹیکسٹائل کی مصنوعات، زرعی اجناس اور پھل، آلات جراحی اور کھیلوں کا سامان برآمد کرتا ہے۔ اس کے پڑھے لکھے ہنر مند تمام ترقی یافتہ ممالک کی ترقی میں کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہاں وسیع صنعتوں تعلیمی اداروں، زرعی فارمز وغیرہ کا جال بچھا ہوا ہے۔ یوں پاکستان اپنے قیام کے مقام سے ترقی کر کے بہت آگے آ چکا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ ہم ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان مزید ترقی کرے اور ہمیشہ ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے رہے تو ہمیں نظریہ پاکستان کو سامنے رکھنا پڑے گا، جس کے مطابق پاکستان میں اسلامی اور جمہوری قدروں کو فروغ دیا جائے گا۔ جہاں ہر کسی کو آگے بڑھنے کے ایک جیسے مواقع حاصل ہوں گے۔ جہاں عدل و انصاف کا بول بالا ہو گا۔ قانون کی بالا

دستی ہوگی۔ خواتین کو ہر طرح کا سماجی اور معاشی تحفظ حاصل ہوگا۔ جہاں غیر مسلموں کے حقوق کی پوری حفاظت ہوگی۔ جہاں دولت چند افراد کے قبضے میں نہیں ہوگی بلکہ پاکستان میں رہنے والے سبھی لوگ یکساں طور پر زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ نظریے کی بدولت ہم پاکستان کو مزید طاقتور اور شاندار بنا سکیں گے تاکہ پاکستان اسلامی اور فلاحی ریاست بن سکے۔

مشق

1-سوالات کے مختصر جوابات

(الف) مسلمانوں کو اپنے دینی معاملات میں اپنی آزادی کب ختم ہوتی نظر آئی؟

جواب: بادشاہ اکبر کی بے جا رواداری اور ملکی سیاست میں ہندوؤں کے عمل دخل کی وجہ سے ملک میں کافرانہ طور طریقے اس قدر رائج ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کی آزادی خود ان کے دینی معاملات میں بھی ختم ہو گئی تھی۔

(ب) سلطان ٹیپو اپنی جدوجہد میں کیوں کامیاب نہ ہو سکا؟

جواب: سلطان ٹیپو نے ہندوؤں اور انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن ملک کے دوسرے سرداروں نے سلطان ٹیپو کا ساتھ نہیں دیا اور اُسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

(ج) تحریکِ خلافت کیوں شروع کی گئی؟

جواب: انگریزوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جنگ کے خاتمے کے بعد ترکی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے خلافت ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مسلمانوں کو اسی فریب سے تکلیف پہنچی اور انہوں نے خلافت کے تحفظ کے لیے تحریک خلافت شروع کی۔

(د) علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کب اور کہاں کیا؟

جواب: علامہ اقبالؒ نے 1930ء میں الٰہ آباد کے مقام پر ایک اجلاس میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے الگ وطن (پاکستان) بنانے کی تجویز پیش کی۔

(ہ) اہلِ مغرب نے قومیت کی بنیاد کس پر رکھی ہے؟

جواب: اہلِ مغرب نے خاندانی، نسلی اور قبائلی بنیادوں میں ذرا وسعت پیدا کر کے قومیت کی بنیادیں جغرافیائی حدود پر استوار کیں اور کہا کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔

(و) مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کیا ہے؟

جواب: مسلمانوں کی قومیت ایک نظریاتی قومیت ہے جو لا الہ الا اللہ پر قائم ہے، یعنی کہ نسل، رنگ اور وطن کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک نظریے، ایک عقیدے، ایک کلمے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اور اس نظریاتی پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے اسے ملت کہا گیا ہے۔

(ز) نظریہ پاکستان کا مقصد کیا ہے؟

جواب: نظریہ پاکستان کا مقصد پاکستان کو ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بنانا ہے۔

(ح) شُدّھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے مقاصد کیا تھے؟

جواب: ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے شدھی کی تحریک شروع کی۔ اور سنگھٹن کی تحریک کا مقصد تھا کہ ہندو مسلمانوں کو ختم کر دیں۔

2- درج ذیل الفاظ و مرکبات کو جملوں میں استعمال کریں۔

الفاظ	جملے
کفر و الحاد	مسلمان کفر و الحاد کا مقابلہ ڈٹ کر کرتا ہے۔
نفاق	مغلوں کے باہمی نفاق سے انگریز غالب آ گئے۔
ولولہ	علامہ اقبال کی شاعری نے مسلمانوں کو ایک تازہ ولولہ دیا۔
مستحکم	ہمیں پاکستان کو مستحکم بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔
زک	ہندوؤں نے ہر موقع پر مسلمانوں کو زک پہنچانے کی کوشش کی۔
خود مختار	پاکستان ایک خود مختار ملک ہے۔
جمعیت	مغربی قوموں کی جمعیت کا انحصار ملک و نسب پر ہے۔
اخوت	مسلمانوں کو آپس میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔
عملِ پیہم	برصغیر کے مسلمانوں نے عملِ پیہم سے الگ وطن حاصل کیا۔
فلاح و بہبود	حکومت کو عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر توجہ دینی چاہیے۔

3- سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

4- سبق کے متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان لگائیں۔

(الف) سبق کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(الف) ڈاکٹر سید عبداللہ (ب) ✓ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں (ج) سر سید احمد خاں (د) جمیل الدین عالی

(ب) اکبر کے دور میں دین کی سربلندی کے لیے کس نے سختیاں جھیلیں؟

(الف) ✓ حضرت مجدد الف ثانی (ب) شاہ ولی اللہؒ (ج) سید احمد بریلویؒ (د) شاہ اسماعیل شہیدؒ

(ج) سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیلؒ کب شہید ہوئے؟

(الف) ۱۸۲۱ء میں (ب) ✓ ۱۸۳۱ء میں (ج) ۱۸۴۱ء میں (د) ۱۸۵۷ء میں

(د) کانگریس کب قائم ہوئی؟

(الف) ✓ ۱۸۸۵ء میں (ب) ۱۸۸۶ء میں (ج) ۱۸۹۵ء میں (د) ۱۹۰۶ء میں

(ہ) مسلم لیگ کس نے قائم کی؟

(الف) سر سید احمد خاں (ب) نواب محسن الملک (ج) قائداعظمؒ (د) ✓ نواب وقار الملک

(و) مصنف نے دنیا میں قومیت کی تشکیل کی کتنی بنیادیں بتائی ہیں؟

(الف) ایک (ب) ✓ دو (ج) چار (د) آٹھ

5- سبق کے متن کو نظر میں رکھ کر درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

1- مسلمان کفر و الحاد کا غلبہ ہوتے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ✓ درست / غلط

2- شاہ اسمٰعیلؒ، سید احمد بریلویؒ کے مرشد تھے۔ درست / غلط ✓

3- سید نے مجبوراً انگریزوں سے مفاہمت کو غنیمت جانا۔ ✓ درست / غلط

4- پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے انگریز کا ساتھ دیا۔ درست / غلط ✓

5- ترکی کو نقصان نہ پہنچانے کا وعدہ فریب ثابت ہوا۔ ✓ درست / غلط

6- مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مغرب کے تصورِ قومیت سے مختلف ہے۔ ✓ درست / غلط

6- کالم (الف) کا ربطہ کالم (ب) سے کیجیے۔

کالم (الف)	کالم (ب)
۱۹۳۰ء	الہ آباد
کانگریس	۱۸۸۵ء
مسلم لیگ	۱۹۰۶ء
۱۸۳۱ء	شہادت شاہ اسمٰعیلؒ
نظریہ پاکستان	اسلامی زندگی

7- سبق میں مذکور شخصیات میں سے کسی ایک شخصیت پر مختصر نوٹ لکھیں۔

جواب: قائد اعظم:

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح تاریخ کی ان چند عظیم شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ قائد اعظم نے بغیر ہتھیار اٹھائے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا حصول ممکن بنایا۔ وہ نہ بکنے والی اور نہ جھکنے والی شخصیت تھے۔ وہ خوش پوش، خوش گفتار اور خوددار انسان تھے۔ وہ نڈر اور دلیر تھے، پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور پاکستانی قوم کے باپ تھے۔ پاکستانی قوم ان کی ممنونِ احسان ہے۔

5 ۔ پرستان کی شہزادی

اشرف صبوحی

خلاصہ

اشرف صبوحی ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ سبق "پرستان کی شہزادی" داستان ہے جس میں پرستان کی سیر کا احوال پیش کیا گیا ہے۔
سیدانی بی کا ایک وقت میں بڑا اشہرہ تھا۔ ان کے ہنر کی دھاک قلعے کی تمام مغلانیوں پر تھی۔ جوڑوں کی سلائی، کڑھائی اور ٹکائی میں کبھی ملکہ نے بلایا تو کبھی نواب سلطان بیگم نے بلا بھیجا۔ پل بھر کی فرصت میسر نہ تھی لیکن جب بڑھاپے نے آگھیرا تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ پڑوس کے میر صاحب نے خدا ترسی کی اور انہیں اپنے پاس رکھ لیا۔
کہا جاتا ہے کہ سیدانی بی نہایت شریف گھرانے کی بیٹی تھیں۔ مرہٹہ گردی میں ان کا خاندان تباہ ہو گیا اور یہ بیوہ ہو گئیں دوسری شادی کو برا خیال کیا جاتا تھا اور سیدانی بی نے رنڈاپا اپنی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری میں گزار دیا۔ جوانی عزت و آبرو سے گزر گئی بہت کمایا لیکن سنبھال کر نہ رکھا پرانے شریفوں میں ایک یہی برائی تھی کہ وقت کی قدر نہیں کرتے تھے۔ بڑھاپے میں انھیں میر صاحب نے اپنے گھر میں جگہ دی اور گھر والے سب ان کی بہت عزت کرتے۔ سیدانی بی پہلے پہل اداس اور شرمندہ سی رہیں لیکن کب تک ؟ پھر خود ہی اُن میں گھُل مل گئیں صبح نماز کے بعد بچوں کو قرآن پڑھاتیں دوپہر میں سلائی کڑھائی اور شام کو کھانوں کی ترکیبیں بتاتیں اور رات کو سوتے وقت کہانیاں سناتیں۔ میر صاحب اور ان کی بیگم خوش تھے کہ بچوں کی تربیت کے لیے خدا نے مفت کی استانی بھیج دی۔
ایک سردیوں کی سرد رات، دالانوں کے پردے پڑے ہوئے، سب بچے بڑے لحافوں میں دبکے سیدانی بی سے کہانی سن رہے تھے۔ کہانی انڈا شہزادی کی تھی. بیگم میر بھی نماز وظیفہ سے فارغ ہو کر وہاں آ بیٹھیں اور باتوں باتوں میں سیدانی بی سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم پرستان سے ہو آئی ہو تو اس پر سیدانی بی نے جواب دیا کہ پہلی بار تو وہ مجھے دھوکے سے لے گئے لیکن جب بھید کھلا تو بہت ڈری لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اس کے بعد جب کبھی دوبارہ جانا ہوا تو ہنسی خوشی گئی اور آئی۔ بیگم میر کہتی ہیں کہ میرا تو خوف کے مارے دم نکل جاتا لیکن شاباش تمہاری تربیت کرنے والوں پر ہے کہ انہوں نے ایسی اچھی تربیت کی۔ سیدانی تم کیوں گئیں ؟ بادشاہ نے مجھے بیٹی کے جوڑے ٹانکنے کے لیے بلایا تھا، سیدانی نے جواب دیا۔
نواب اعظم الدولہ کی بیٹی کی شادی تھی، دن رات کام تھا، ایک دن بلاوے آتے رہے لیکن میں نہ گئی اپنی پسند کا پکوان بنوایا جمعے کا دن تھا نہائی دھوئی اور خوب آرام کیا۔ شام کو کسی نے آواز دی کہ سرکار نے بلایا ہے میں بڑے نخروں سے جایا کرتی تھی۔ وہ اپنے پسندیدہ پکوان کو چھوڑ کر جانا میری عادت کے برعکس تھا لیکن میں نے انکار نہ کیا اور سر پر چادر اوڑھ ساتھ ہولی تھوڑا دور جا کر احساس ہوا کہ پاس ہی تو گھر ہے یہ کہار کہاں لے جا رہے ہیں اور نہ ہی ہٹو بچو کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ذرا پردہ سرکا کر دیکھا تو جنگل اور سائیں سائیں کی آوازیں۔ کہاروں سے دریافت کیا جواب ملا کہ بادشاہ سلامت نے بلایا ہے کچھ دیر کے بعد پھر پوچھا کہ میں سیدانی ہوں سچ بتاؤ کہاں لے جا رہے ہو تم سب کو راکھ کر دوں گی اس نے جواب دیا سیدانی بی گھبراؤ نہیں ہمارے بادشاہ سلامت سیدوں کو بہت مانتے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے دیکھا کہ پالکی ایک محل کے آگے رکی ہوئی ہے۔ فانوس نہیں ہیں لیکن روشنی بہت ہے۔ پریاں اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں اور بڑی رونق لگی ہے کہ ایسی رونق تو ہمارے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں ایک پری میرے پاس آئی اور مجھے بادشاہ اور بیگم بادشاہ کے پاس لے گئی۔ سونے چاندی کے درخت اور پھل پھولوں کی جگہ ہیرے جواہرات لٹکے ہوئے ہیں بادشاہ

کے دربار میں بلور کی کرسیاں بچھی ہیں اور ان پر پری زاد بڑی شان اور تمکنت سے بیٹھے ہیں۔ بادشاہ سلامت یاقوت کے تخت پر بیٹھے ہیں ان کے پہلو میں چودہ پندرہ برس کی لڑکی بیٹھی ہے۔

کانپتے جسم سے آگے بڑھی بیگم بادشاہ بولیں گھبراؤ نہیں سیدانی بی تمہیں علم نہیں کہ ہم اس نام کی کتنی عزت کرتے ہیں تو مجھے حوصلہ ہوا کہ یہ مسلمان ہیں کوئی ڈر نہیں. بیگم بادشاہ نے کہا کہ سیدانی سارا راستہ تم ڈرتی آئی ہو۔ میں نے جواب دیا سرکار سنسان جنگل اور پھر کہار کی شکل ایسی کہ ڈر تو لگے گا ہی۔ میرے چاروں طرف دیکھنے پر بیگم بادشاہ کو شک ہوا انہوں نے کہا کہ ہماری شکلیں اصلی ہیں نہ گھبراؤ۔ شہزادی ہنسی اور کہنے لگی کہ موئے بکر گدھے نے ڈرایا ہو گا۔ اتنے میں خوان اترنے لگے۔ ایک بالشت کے پودے پھلوں سے لدے۔ میں کیا کھاؤں اور کیا نہ کھاؤں بیگم بادشاہ نے کہا کہ سیدانی بی ہاتھ بڑھاؤ تو باقی بھی شامل طعام ہوں۔ عرض کیا بیگم بادشاہ کھانے کی چیز ہو تو کھاؤں، انہوں نے جواب دیا کھانے کے بارے میں سوچیئے، وہی ذائقہ اور مزہ آئے گا۔ ایک زرد زرد پھل توڑا سب بونٹ پلاؤ کے ذائقے بھول گئی محل میں بیسیوں مرتبہ بڑے مزے کے پکوان کھائے لیکن ان کا ذائقہ ہی الگ تھا۔ پانی کی طلب پر یاقوتی گلاس آپ ہی آپ لبوں سے آلگا۔ کھانے کے بعد پان کھایا اور ایسا ذائقہ کہ محمد شاہ رنگیلا کی کوکلا بائی کے پان کو بھی مات دے۔ کھانے سے فارغ ہو کر بیگم بادشاہ نے توشہ خانے والیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کے کپڑے لاؤ۔ بڑوں بڑوں کے کپڑے دیکھے ٹانکے لیکن کجا دنیا کے کپڑے کجا پرستان کے۔ بیگم بادشاہ نے کہا لو سیدانی بی اپنی ہنر مندی کا مظاہرہ کرو۔ سوچ میں پڑ گئی کہ کون سی وضع ٹانکوں؟ بیگم بادشاہ سے کہا کہ صبح ہونے دیں تو بادشاہ بیگم ہنس پڑیں کہ یہاں صبح شام کا تصور نہیں، بسم اللہ کریں۔ سوچا دیر کیوں کریں سامان کتر بیونت موجود ہے کام شروع کیا پہلے ہی سوٹ میں واہ واہ ہو گی پھر تو جیسے مجھے پر لگ گئے ہوں۔ ناچ گانا شروع ہوا لیکن میں اپنے کام میں مگن رہی کہ جلدی جلدی کام نپٹاؤں اور گھر جاؤں۔ شہزادی کہتی سیدانی خالہ یہیں رہ جاؤ کیوں جاتی ہو لیکن میں نہ مانی۔ جہیز ٹانکنے سے فراغت کے بعد بیگم بادشاہ سے کہا کہ مجھے بھجوا دیں انہوں نے شادی تک رکنے کا کہا لیکن میں نہ مانی اور واپس آنے لگی تو بادشاہ نے مجھے انعام و اکرام سے نوازا اور پالکی میں سوار ہوئی۔ بادشاہ کے دیئے ہوئے انعام کو پتھر جان کر سارے راستے پردے کی جھری سے باہر پھینکتی آئی، گھر پہنچ کر چراغ کی لو میں دیکھا تو جواہرات، سر پکڑ لیا کہ اتنی دولت یوں ہی لٹا دی لیکن کیا کر سکتی تھی۔ بوا نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگ رہی تھیں۔ بونٹ پلاؤ ویسے ہی دم پر لگا تھا بوا کہنے لگی، گئی نہیں ہو جواب دیا، راستے سے ہی لوٹ آئی ہوں۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

سیدانی: "وہ قصہ یاد آتا ہے، تو کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ پرستان کی شہزادی جس کے جوڑے ٹانکنے گئی تھی، بہت سر ہوئی۔ دوسری پریوں نے بھی منتیں کہیں کہ سیدانی اماں، یہیں رہ جاؤ۔ دنیا میں اب تمھارا کون ہے؟ مگر میں نے ایک نہ مانی۔ مجھ بدنصیب کو تو اپنے جیسے انسانوں کی بے مروّتیاں دیکھنی تھیں، پرستان میں کیوں بستی؟ وہ تو اللہ نے تمھارے دل میں رحم ڈال دیا جو گور گڑھے کا ٹھکانہ ہو گیا۔

سبق کا عنوان: پرستان کی شہزادی **مصنف کا نام:** اشرف صبوحی

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
ٹانکنے	سلائی کرنا، کشیدہ کاری کرنا	بدنصیب	بدقسمت
بے مروّتیاں	بے اعتنائی، اچھا برتاؤ نہ کرنا	گور	قبر

سیاق وسباق:

سیدانی بی جو مرہٹہ گردی میں بیوہ ہو گئیں۔ ایک شریف گھرانے کی بیٹی تھیں۔ دوسری شادی کو برائی خیال کرتے ہوئے انھوں نے مغلانی کا پیشہ اختیار کیا اور اپنی بیوگی کا زمانہ اپنی ہنر مندی اور سلیقہ شعاری کی بنا پر گزار دیا۔ قلعے میں اور دوسرے نوابوں اور امرا کے ہاں ان کی سلیقہ مندی کی بڑی شہرت تھی۔ امرا اور عمائدین اپنی بیٹیوں کے جہیز ٹانکنے کے لیے انھیں بلاتے تھے۔ جوانی کے زمانے میں بہت کمایا لیکن محنت سے کمایا ہوا روپیہ سنبھال نہ سکیں۔ بڑھاپے میں دوسروں کے دروں کی ٹھوکریں کھانی پڑیں لیکن میر صاحب اور ان کی بیگم نے انھیں اپنے گھر میں پناہ دی اور وہ بھی ان کے بچوں کی تربیت میں لگ گئیں۔ سیدانی بی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پرستان سے ہو آئی ہیں۔ جب اُن سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے پرستان کی سیر کا احوال سنانا شروع کیا۔ یہ اقتباس اسی موقع سے لیا گیا ہے۔

تشریح:

اشرف صبوحی مشہور کہانی نویس تھے۔ زیر نظر نثر پارہ ان کی داستان کا حصہ ہے جس میں سیدانی پرستان کی سیر کے دوران کا تجزیہ پیش کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جب پرستان کی سیر کا قصہ یاد آتا ہے تو ڈر اور خوف محسوس ہوتا ہے اور پچھتاوا بھی ہوتا ہے کہ کیوں واپس آگئی۔ پرستان کی شہزادی سہیل پری جس کے جہیز کے کپڑے تیار کرنے گئی تھی ضد کر رہی تھی کہ واپس خاکی دنیا میں نہ جاؤ۔ وہ پریاں جن سے تعلق بن گیا تھا وہ بھی ضد کر رہی تھیں کہ پرستان میں ہی رہ جاؤ۔ دنیا میں اب تمھارا کوئی نہیں۔ والدین اور شوہر مرہٹہ گردی میں مارے گئے تھے۔ میں اکیلی تھی چنانچہ ان کا خیال تھا کہ مجھے اب پرستان میں ہی قیام پذیر ہو جانا چاہیے۔ لیکن میں واپس آنا چاہتی تھی۔ شاید میرے نصیب میں یہی لکھا تھا کہ اُن انسانوں کی بے اعتنائی اور بے وفائی دیکھوں جو کبھی مطلب کے لیے میرے پیچھے پیچھے گھومتے تھے۔ چنانچہ اللہ نے ان لوگوں کی اصلیت آشکار کرنا تھی اس لیے واپس آنا قسمت میں لکھا تھا۔ لیکن واپس آکر پچھتاوا ہے کہ کیوں واپس آئی۔ وہی امرا و رؤسا جو گزارش کرکے مجھے بلا کر کام کرواتے تھے اب مطلب نہیں رہا تو آنکھیں پھیر چکے تھے۔ بڑھاپے میں جسمانی طاقتیں جواب دے گئیں اور کام کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اب اپنا کوئی نہیں تھا۔ بس میر صاحب اور ان کی بیوی نے گھر میں پناہ دی ہے تو زندگی آسان ہوگئی اور کفن دفن کا انتظام بھی ہو گیا ورنہ ذلیل وخوار ہوتی۔

اقتباس 2:

اُس کی کارسازی کے قربان، صدقے مشکل کشا کے، عقل نے ایسا کام دیا اور پہلے ہی جوڑے میں واہ واہ ہوگئی۔ شہزادی کا چہرہ بھی خوشی کے مارے پھول کی طرح کھل گیا۔ اب کیا تھا میرے ہاتھ پاؤں میں گھوڑے لگ گئے۔ دنوں کا کام گھڑیوں میں ہونے لگا۔ کہانی بہت لمبی ہے، کہاں تک کہوں، جس کام کی آدمی دُھن باندھ لے، وہ ہو ہی جاتا ہے۔ آخر سارے جوڑے سل بھی گئے اور ٹک بھی گئے۔ کتنے دن لگے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے۔

سبق کا عنوان: پرستان کی شہزادی **مصنف کا نام:** اشرف صبوحی

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
کارسازی	کام بنانا، کام کرنا	واہ وا	تعریف و تحسین
مشکل کشا	مشکلات حل کرنے والا	دُھن باندھ لینا	خیال جمانا، لگن پیدا کرنا

تشریح:

اشرف صبوحی کا شمار ممتاز نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ سبق پرستان کی شہزادی ان کی معروف داستان ہے جس میں پرستان کی سیر کا احوال پیش کیا گیا ہے۔

زیرِ تشریح نثر پارے میں سیدانی بی جو پرستان میں بادشاہ کی بیٹی کا جہیز ٹانکنے گئی تھی، پرستان میں اپنے کام کا احوال بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کام بنا دیا مشکل کشا نے دستگیری کی۔ سمجھ بوجھ میں ایسی وضع کا خاکہ آیا کہ جیسے ہی اس طرز اور اس بناوٹ کا جوڑ اسلائی کیا اور اس پر کشیدہ کاری کی اسے دیکھ کر سب اش اش کر اٹھے۔ شہزادی بھی وہ جوڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ بس اب میں نئی نئی وضع کے جوڑے ٹانکتی گئی۔ تیز رفتاری سے کام کرتی گئی۔ دنوں کا کام لمحوں میں ہونے لگا۔ یوں پورے جہیز کے کپڑے ٹانک دیے۔ بس اصول یہی ہے کہ جس کام کی دھن باندھ لیں ذوق وشوق سے کریں۔ محنت کریں۔ وہ کام ہو ہی جاتا ہے۔ بالآخر جہیز کے سارے جوڑے سل بھی گئے اور ان پر کڑھائی کا کام بھی ہو گیا۔ سارا کام شاندار تھا پرستان میں دن اور رات کی تخصیص نہیں ہوتی۔ اب وہاں کتنے دن لگے نہیں بتایا جا سکتا کیوں کہ وہاں وقت کا حساب ہے ہی نہیں ہاں جتنا کام تھا اگر یہاں دنیا میں انسانوں میں کیا جاتا تو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگتا۔

مشق

1-سوالات کے مختصر جوابات

(الف) سیدانی بی نے گزر اوقات کے لیے کون سا پیشہ اختیار کیا؟

جواب: سیدانی بی نے گزر اوقات کے لئے مغلانی کا پیشہ اختیار کیا۔

(ب) میر صاحب اور ان کی بیوی سیدانی بی کی کس بات پر زیادہ خوش تھے؟

جواب: میر صاحب اور ان کی بیوی دونوں خوش تھے کہ سیدانی بی کو بچوں کی تربیت کے لیے خدا نے بھیج دیا۔ ایسی شریف، نماز روزہ کی پابند، ہنر مند استانی صرف روٹیوں پر کہاں میسر آتی ہے۔

(ج) پرستان کے بادشاہ نے سیدانی بی کو کس کام کے لیے بلوایا تھا؟

جواب: پرستان کے بادشاہ نے سیدانی بی کو اپنی بیٹی کا جہیز ٹانکنے کے لیے بلایا تھا۔

(د) بادشاہ بیگم کا اصلی نام کیا تھا؟

جواب: بادشاہ بیگم کا اصلی نام زمرد پری تھا۔

(ہ) پرستان کے پھلوں کی خاص بات کیا تھی؟

جواب: پرستان کے پھلوں کی خاص بات یہ تھی کہ ایک پھل توڑنے کے بعد فوراً دوسرا پھل نکل آتا تھا اور جس پھل کا سوچتے اُس کا ذائقہ محسوس ہوتا تھا۔

2-سیدانی بی نے پرستان کا تذکرہ دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ آپ اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ لکھیے۔

3- سبق کے متن کو مدنظر رکھ کر درست جوابات کی نشاندہی کریں۔

(الف) سبق "پرستان کی شہزادی" کس مصنف کی تحریر ہے؟

(الف) شاہد احمد دہلوی (ب) ہاجرہ مسرور (ج) ✓ اشرف صبوحی (د) سجاد حیدر یلدرم

(ب) قلعے کی بڑی بڑی مغلانیاں، سیدانی بی کے سامنے:

(الف) کام کرتی تھیں (ب) کھڑی رہتی تھیں (ج) دم نہ مارتی تھیں (د) ✓ کان پکڑتی تھیں

(ج) پرستان کے بادشاہ نے سیدانی بی کو بلایا تھا۔

(الف) ✓ بیٹی کا جہیز ٹانکنے کو (ب) انعام دینے کو (ج) بیٹی کو سینا پرونا سکھانے کو (د) ملازمہ رکھنے کے لیے

(د) سیدانی کو کھانے میں مرغوب تھا:

(الف) زردہ (ب) ✓ بونٹ پلاؤ (ج) فیرنی (د) بریانی

(ہ) پرستان میں پھل دار پودے بڑے تھے۔

(الف) ✓ بالشت بھر (ب) چھ فٹ (ج) ایک ایک فٹ (د) گز بھر

(و) پرستان سے سیدانی بی کو انعام میں کیا ملا؟

(الف) روپیا پیسا (ب) کنکر پتھر (ج) خلعت اور زیورات (د) ✓ جواہرات

4- مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجئے۔

جوابات:

1- اوسان خطا ہونا، (ڈر جانا) سانپ کو دیکھ کر ہمزہ کے اوسان خطا ہو گئے۔
2- آنکھیں کھلنا، (ہوش آنا، عقل آنا) جلد ہی عمر دراز کی آنکھیں کھل گئیں ورنہ اکبر کی دوستی اسے لے ڈوبتی۔
3- کلیجے پر سانپ لوٹنا، (رشک کرنا، حسد کرنا) علی کی ترقی سے اسلم کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔
4- بال بیکا ہونا، (نقصان ہونا) اللہ کی رحمت شامل حال ہو تو کسی کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔
5- عقل جاتی رہنا، (ہوش جاتے رہنا) گھر کے آئے دن کے لڑائی جھگڑے سے دانش کی عقل جاتی رہی۔

5- کالم (الف) کا ربطہ کالم (ب) سے کیجئے۔

کالم (الف)	کالم (ب)
مرہٹہ گردی	تباہی
میر صاحب	خوش مزاج
انڈا شہزادی	کانٹرادیو
بکر گدھا	جن
ہنر	دھاک

6- سبق کے مطابق درست لفظ کے ذریعے خالی جگہ پُر کیجئے۔

1- ایک وقت تھا کہ ـــــــــ میں سیدانی بی کا بڑا مقام تھا۔ (✓ قلعہ، محل، دربار)

2- سیدانی بی کو مغلانی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا کیونکہ ـــــــــ۔ (اس کے والدین فوت ہو گئے، تجارت میں خسارہ ہو گیا، ✓ وہ بیوہ ہو گئیں)

3- اس نے کہاروں سے کہا: "کم بختو! منہ سے کچھ تو ـــــــــ۔ (کہو، ✓ پھوٹو، بولو)

4- پرستان میں اسے ـــــــــ لے گیا۔ (✓ جن، پری زاد، فرشتہ)

5- بادشاہ نے اسے ـــــــــ انعام میں دیے۔ (زیورات، ✓ جواہرات، ملبوسات)

ذو معنی الفاظ:

ایسے الفاظ کا املا تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن ان کے دو معنی ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض اوقات ایک معنی میں مذکر جبکہ دوسرے معنوں میں مونث ہوتا ہے۔

7- ذیل کے جملوں میں سے ذو معنی الفاظ الگ کر کے ان کے معنی لکھیے۔

١- بارشوں سے آئینے کی آب جاتی رہی، 1- آب۔ پانی، 2- آب۔ صفائی (آئینے کی چمک)

٢- سوات میں کون سی کان ہے؟ 1- کان۔ سننے کا ایک عضو 2- کان۔ معدن۔ منبع چشمہ

٣- بادشاہ بیگم کے حکم پر شہزادی کے کپڑوں کے لئے تھان پہ تھان آنے لگے۔ 1- تھان۔ مقام جگہ 2- تھان ٹکڑا۔ کپڑے کی مقرر مقدار جو کارخانے سے تہ ہو کر بکنے کے لیے آئے۔

٤- حق بات کہنے کی پاداش میں وہ دار پر جھول گیا۔ 1- دار۔ گھر۔ مکان 2- دار۔ پھانسی کی لکڑی، سولی

٥- جہاں چاہ وہاں راہ۔ 1- چاہ۔ محبت 2- چاہ۔ کنواں

8- درج ذیل الفاظ کے متضاد تحریر کیجئے۔

الفاظ	متضاد
لطیف	کثیف
شب	روز
خشک	تر
طاق	جفت
شیریں	کڑوا
نشیب	فراز
تریاق	زہر

6 ۔ اردو ادب میں عید الفطر

ڈاکٹر وحید قریشی

خلاصہ

ڈاکٹر وحید قریشی اُردو زبان و ادب کے اہم محقق اور نقاد تھے۔ان کا زیادہ تر ادبی سرمایہ تنقیدی کتب پر مشتمل ہے۔اس سبق میں انہوں نے عید الفطر کے حوالے سے ادبی تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

اُردو کی غزلیہ شاعری عید کے چاند اور محبوب سے روزِ عید کی ملاقاتوں تک محدود تھی لیکن 1857ء کے بعد یہ ملی احساسات کی ترجمان بھی بن گئی۔ شعراء کی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت عید الفطر کا موضوع کی جہتوں تک پھیل گیا ہے۔ عید کا موضوع محدود معنوں کے بجائے اب مسلمانوں کی تہذیبی اور فکری زندگی کے وسیع تر جغرافیے سے مل گیا ہے۔ عید سے متعلقہ نظموں میں متوسط اور غریب طبقے کے مسائل و حالات کا عکس موجود ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے دلی کی بربادی کے نوحوں میں شاہی خاندان کے افراد کی کسمپرسی میں عید بسر کرنے کا نقشہ کھینچاہے۔ سرسید نے اس روایت کا آغاز کیا جب انہوں نے مسلمانوں کی معاشرتی خامیوں کے علاوہ ان کی غربت کی منظر کشی بھی کی۔ عید سے متعلقہ شاعری میں عید کو مذہبی اقدار سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ اقبال کے مطابق ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے۔ یتیموں پر عید بھاری گزرتی ہے اور بچپن میں چاند کیسا دکھتا تھا۔ مجموعی طور پر عید کے چاند کی منظر کشی، عید کو داخلی مسرت اور خارجی حالات سے منسلک کرنا، ہلالِ عید کو ملی عزائم کی علامت اور ملت کے عروج وزوال کی علامت کے طور پر پیش کرنا۔ عید کے حوالے سے نمایاں موضوعات میں عید کی شاعری ہماری شعری روایات کا ناقابل فراموش حصہ ہے جس میں عید محض تہوار منانے کی ایک سمت تک محدود نہیں بلکہ ہماری اقدار اور ہمارے داخلی رویوں کی بھی عکاس ہے۔

نثرپاروں کی تشریح

اقتباس 1:

اس رجحان نے تخلیقی سطح پر ایک نئی سمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا بے موقع نہ ہوگا کہ عید کا تصور مسلمانوں کے ہاں محضتہوار منانے اور اُچھل کود کو کلچر بنانے پر منحصر نہیں بلکہ اس خوشی کا رشتہ ہماری اقدار میں بہت دور تک جاتا ہے۔

سبق کا عنوان: اردو ادب میں عید الفطر **مصنف کا نام:** ڈاکٹر وحید قریشی

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
رجحان	میلان	بے موقع	بے محل
تہوار	خوشی کا دن	تخلیقی	پیدا کرنا، طبع زاد فن پارہ

سیاق وسباق:

عید الفطر اس عید کو کہتے ہیں جو فرزندانِ توحید ماہِ صیام کے روزے ختم ہونے کی خوشی میں یکم شوال کو مناتے ہیں۔ اس عید میں اللہ تعالیٰ نے افرادِ معاشرہ کے لیے بھلائی کا پہلو بھی رکھا۔ اردو کی غزلیہ شاعری میں عید، عید کا چاند، ہلال ابرو اور اس کے متعلقات ہی اہم رہے۔ 1857ء کے بعد جب اردو شاعری میں وسعت پیدا ہوئی تو نئے موضوعات متعارف ہوئے۔ شعرا اور ادبا نے جب تخلیقی جوہر کے حوالے سے افکار پیش کیے مسلمانوں کی تہذیبی اور فکری زندگی کو وسیع تر جغرافیے سے ملا دیا اور عید کے موضوعات میں نئی نئی باریکیاں پیدا کر کے اسے ادبی خوشی کے ملے جلے جذبات تک لے گئے۔

تشریح:

ڈاکٹر وحید قریشی مشہور نقاد اور ادیب تھے۔ سبق اردو ادب میں عید الفطر میں انھوں نے عید الفطر کے حوالے سے نثر اور شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح نثر پارے میں وہ کہتے ہیں کہ عید الفطر کے حوالے سے نثر نگاروں نے جس وسعت پذیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ غریب وامیر، مالکن اور نوکرانی، سہاگن اور کنواری، بچے اور بڑے غرض مسلم معاشرے کے ہر شعبے اور ہر طبقے کے حوالے سے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

مسلم معاشرے کے مختلف طبقات عید پر جن حالات سے گزرتے ہیں اور عید جس انداز سے مناتے ہیں ہر پہلو کو نثر میں موضوع بنایا گیا ہے چنانچہ یہ موضوع اب محدود نہیں رہا بلکہ ہمہ جہت وسعت اختیار کر چکا ہے۔ اسی طرح شاعری میں بھی شعرا نے مختلف موضوعات کی عکاسی کی ہے۔ ہلال عید کی منظر کشی امت مسلم کا عروج وزوال، اندرونی خوشی اور بیرونی حالات چنانچہ اب شاعری میں بھی یہ موضوع تین سمتوں میں پھیل چکا ہے۔ اس رجحان نے تخلیقی سطح پر ایک نئی سمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا بے موقع نہ ہو گا کہ عید کا تصور ہم مسلمانوں کے ہاں محض تہوار منانے اور رقص وسرود کی ثقافت بنانے تک محدود نہیں ہے۔

بلکہ عید کے حوالے سے ہماری تمام اقدار کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ خوشی کا تہوار ہماری تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے حوالے سے شاعری بھی ہماری قدروں کی ترجمان ہے۔

مشق

1- سوالات کے مختصر جوابات

(الف) عید الفطر کا ہماری تہذیبی اور دینی زندگی سے کیا تعلق ہے؟

جواب: عید الفطر ہمارے دینی جذبے کی شدت اور مذہبی امور سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ ایک وقتی جذبہ نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی اکائی بن کر ہماری معاشرتی زندگی میں بہت دور تک جاتی ہے۔

(ب) عید الفطر پر نظموں میں، شعرا نے کیا باریکیاں پیدا کی ہیں؟

جواب: عید الفطر کے موضوعات میں اشاراتی اور علامتی امکانات زیادہ اجاگر ہوئے، ملی احساسات کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا گیا۔ عید کے موضوعات میں نئی نئی باریکیاں پیدا کر کے اسے ادبی خوشی کے ملے جلے جذبات تک لے گئے۔

(ج) اس سبق کی روشنی میں اردو شعرا نے عید الفطر کے جن متعدد پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں سے کوئی سے تین پہلوؤں / موضوعات کے نام لکھیے۔

جواب: ہلالِ عید کی منظر کشی، عید اور مسلمانوں کے داخلی و خارجی حالات، مسلمانوں کا عروج و زوال، ہلالِ عید اور ملّی عزائم، رسول اللہؐ کی عید، عیدی وغیرہ۔

(د) عید الفطر کے موقع پر شہزادوں اور شہزادیوں کا ذکر کرتے ہوئے، خواجہ حسن نظامی نے کیا نکتہ اجاگر کیا ہے؟

جواب: عید الفطر کے موقع پر دولت و عزت سے محروم ہونے والے شہزادوں اور شہزادیوں کی قسم پرسی میں عید بسر کرنے کا ذکر اہمیت رکھتا ہے۔

2-اردو شعرا نے ہر دور میں عید الفطر کو موضوع سخن کیوں بنایا؟

جواب: مجموعی طور پر عید الفطر سے متعلق موضوعات ہماری شاعری کے بنیادی رخ کو ظاہر کرتے ہیں۔ عید کا تصور محض تہوار نہیں بلکہ اس خوشی کا رشتہ ہماری اقدار میں بہت دور تک جاتا ہے۔ اس کا تعلق ہمارے داخلی اور خارجی رویوں کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ اس وسعت پذیری کی وجہ سے شاعروں نے اسے موضوعِ سخن بنایا ہے۔

3-کون سی چیز اقبالؒ کو عید کے چاند کی تصویر کشی پر مجبور کرتی ہے؟

جواب: یاد طفلی علامہ اقبال کو عید کے چاند کی تصویر کشی پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ منظر کشی کرنے والے رجحان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اے مہ عید! بے حجاب ہے تو
حسنِ خورشید کا جواب ہے تو

4-"مہ صیام گیا اور روز عید آیا" یہ اردو کے کس معروف شاعر کا مصرع ہے؟

جواب: یہ اردو کے معروف شاعر مولانا حالی کا مصرع ہے۔

5-عید کی شاعری کا ہماری شعری روایات سے کیا تعلق ہے؟

جواب: عید کی شاعری کا ہمارے داخلی رویوں کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ ہماری شعری روایت میں یہ عمل صرف یکطرفہ مناظر کشی تک جا کر ختم نہیں ہوتا۔ عید کی شاعری ہماری شعری روایات کا ایک اہم اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔

6-سبق کے متن کو مد نظر رکھ کر درست یا غلط کی نشاندہی کریں۔

(الف) ۱۸۵۷ء یہ دنیا والے تو نہیں کہتے سونگی جنگ آزادی کے بعد اردو شاعری میں وسعت پیدا ہوئی۔	✓درست / غلط
(ب) خواجہ حسن نظامی نے دِلّی کی بربادی کے مرثیے لکھے ہیں۔	درست / غلط ✓
(ج) عید الفطر کے متعلق موضوعات ہماری شاعری کا اصل رخ ظاہر کرتے ہیں۔	✓درست / غلط
(د) سبق میں چار شعرا کے اشعار درج ہیں۔	درست / غلط ✓
(ہ) عید الفطر کا تصور ہماری اقدار میں شامل ہے۔	✓درست / غلط

7-درست جواب کی نشاندہی کیجیے۔

(الف) یہ مصرع کس شاعر کا ہے؟ "ہلالِ عید کی گردوں پہ آمد آمد ہے"۔

(الف) اقبالؒ　(ب) حفیظ جالندھری　(ج) ✓عبدالمجید سالک　(د) حالیؔ

(ب) حسن نظامی نے دِلّی کے جو نوحے لکھے، ان میں کون سی چیز نمایاں ہے؟

(الف) عظمتِ رفتہ　(ب) احساسِ شادمانی　(ج) ✓عید کا ذکر　(د) لُطف و مسرت

(ج) عید الفطر کے موقع پر مسلم معاشرے کے کس طبقے کو سب سے زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

(الف) اُمرا　(ب) ✓غُربا　(ج) متوسط　(د) درمیانہ متوسط

(د) شاعر نے "لذت افزائے شورِ طفلی" میں کس کی طرف اشارہ کیا ہے؟

(الف) بادل　(ب) ستارے　(ج) ✓عید الفطر کا چاند　(د) نمازِ عید الفطر

(ہ) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد توجہ تیز ہو گئی۔

(الف) غزلوں کی طرف　(ب) ✓نظموں کی طرف　(ج) مرثیے کی طرف　(د) شہر آشوب کی طرف

8-مصنف نے عید کا تعلق تہوار کے علاوہ کس سے جوڑا ہے؟ دو تین سطروں میں جواب لکھیں۔

جواب: مصنف نے عید کا تعلق تہوار کے علاوہ اردو شاعری اور اسلامی اقدار سے جوڑا ہے۔

7 ۔ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

سجاد حیدر یلدرم

خلاصہ

سجاد حیدر یلدرم کا شمار اُردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ افسانہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"، میں بھی سجاد حیدر یلدرم نے دوستی کے منفی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ اگرچہ دوستی ایک حسین اور مقدس رشتہ ہے لیکن بعض دوستوں کے غلط رویے دوستی جیسے خوبصورت رشتے پر بھی منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔

مصنف کہتا ہے کہ ایک دن دلی کے چاندنی چوک میں ایک فقیر اپنی غریب الوطنی اور دوست نہ ہونے کی شکایت کرتے ہوئے نظر آیا بظاہر وہ موٹا تازہ اور ایک حد تک خوبصورت تھا مگر بد معاشی نے اس کی صورت مسخ کر دی تھی۔ فقیر تو اپنا قصہ کہہ کر آگے بڑھ گیا لیکن مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں وہ مجھ سے بہتر ہے۔ میں نے سوچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اُس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں، میں حسرت سے کہتا ہوں کہ میرے اتنے دوست ہیں۔

میں نے سوچا کہ فقیر کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے تو اُس کے لئے یہ غنیمت ہے۔ میرا ایک دوست ایسا ہے جو راستے میں ملے گا اور کہے گا بھائی جان میں تمہیں پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے اس وقت ضرورت ہے تھوڑا سا روپیہ قرض دو۔ کیا فقیر کے دوست اسے وقت بے وقت دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا اُسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اُس کے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جس پر اُسے رائے کا اظہار کرنا پڑے؟ کیا اُسے دوستوں کے ہاں ملاقات کو نہیں جانا پڑتا؟ اگر نہیں تو خدا جانے وہ کون سی نعمت چاہتا ہے۔

میں دوستوں کو برا نہیں کہتا، وہ میرے خیر طلب ہیں، وہ مجھے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں مگر مجھے نقصان ہو جاتا ہے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ احباب کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں میں عمر نہیں گزارنی تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں اُن کا آنا بھونچال سے کم نہیں ہے جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں "کوئی آ رہا ہے قیامت نہیں" وہ جب بھی آتے ہیں اتنا شور کرتے ہیں کہ جاتے ہوئے میرے کُل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔

دوسرے دوست محمد تحسین ہیں ان کے پاس باتیں کرنے کے لئے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون نہیں۔ اگر میں کبھی پالیٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں تو تحسین فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔

اسی طرح میرے مقدمے باز دوست ہیں جنہیں جھگڑوں اور مخالفین کی برائی کرنے سے فرصت نہیں۔ من جملہ اور بہت سی مختلف قسموں کے دوستوں میں محمد شاکر خان صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں

جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے یہ کہہ کر کہ دیہات میں تبدیلی آب وہوا بھی ہو گئی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔

شاکر صاحب کی کوٹھی میں جو کمرہ میرے لیے تیار کیا گیا تھا اُس کی کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی اور دلفریب منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ ناشتے کے بعد کمرے میں جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ کہیں آج ہی سے کام شروع نہ کر دینا۔ گاڑی تیار ہے مچھلی کا شکار کھیلیں گے اور پھر آپ کو احمد نگر کے رئیس راجہ طالبعلم سے ملائیں گے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ سکون یہاں بھی میسر نہیں خیر سیکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت جانے سے بچ گیا۔ میں نے کمرے میں آکر غور سے میز کے سامان کو دیکھا۔ اعلی درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں تھا۔ آخر کار میں نے وہی اپنا پرانا استعمال مگر مفید بکس نکالا اور لکھنا شروع کیا۔

میرے کمرے کے قریب شاکر خان صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرا ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دلچسپی ہے انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محفوظ فرمایا اس کے بعد میرے خیالات میرے دماغ سے غائب ہو گئے اور میں کچھ لکھ نہ سکا۔

پھر خیالات کے سلسلے کو جوڑنے کی کوشش کی۔ مضمون لکھنے بیٹھا تو شاکر خان صاحب نے نیچے بلا لیا اس مرتبہ انہوں نے اپنے دوست راجا طالب علی صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ میں اُس عربی گھوڑے کی مانند تھا جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ اُن کے دوست سے نجات پاکر اپنے کمرے میں آیا تو طبیعت اُچاٹ ہو گئی تھی۔ ہزار کوشش کے بعد لکھنا شروع کیا۔ خوش قسمتی سے آدھ گھنٹہ ایسا ملا کہ کوئی آیا گیا نہیں۔ دروازے پر دستک ہوئی دریافت کیا تو پتا چلا کہ سرکار نیچے بلاتے ہیں۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہو گا میں تمہیں اس واسطے نہیں لایا کہ دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو۔ واپس کمرے میں آکر تھوڑی دیر لیٹ گیا تیسرے پہر اُٹھا تو دماغ بہت صحیح پایا۔ خوش خوش اُٹھ کر میز پر گیا اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک۔

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے میں فوراً نیچے جاتا ہوں تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب کہتے ہیں "آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے" میں سچی بات کہوں کہ "کچھ بھی نہیں لکھا" تو وہ ہنس کر جواب دیتے ہیں کہ آخر اس قدر کسرِ نفسی کی کیا ضرورت ہے۔

شام کو واپس آئے۔ سوتے وقت اپنا دن بھر کا کام دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصہ میں آکر اُسے پھاڑ دیتا ہوں اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکرا اور احسان فراموش کہاں جاؤں گا مگر میں مجبور ہوں اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔ میں نے ذرا تفصیل سے ان کا حال بیان کیا ہے مگر یہ نہ سوچنا کہ احباب کی فہرست ختم ہو گئی ہے۔ ابھی بہت سے باقی ہیں ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ قرض مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ اس وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔

ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ میری دعوت کرنے کا سوچتے رہتے ہیں پر کبھی کی نہیں۔ ایک دوست ہیں جو آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں اور جب جواب دیا جائے تو سنتے نہیں۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں مگر اپنی طبیعت کا کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں:

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

نثرپاروں کی تشریح

اقتباس 1:

"دیکھو، پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے اس وقت ضرورت ہے تھوڑا سا روپیا قرض دو۔" کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آ رہے ہوں مگر یار دوستوں کا مجمع ہے، جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں، جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اُسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا؟ اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ ہٹا کٹا ہے اور مَیں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ، کیا اس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا، خدا جانے وہ کون سی نعمت چاہتا ہے؟

سبق کا عنوان: مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ **مصنف کا نام:** سجاد حیدر یلدرم

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
احباب	دوست	ریویو	جائزہ
نحیف و نزار	کمزور اور ناتواں	قرض	اُدھار

سیاق و سباق:

اس سبق میں مصنف نے دوستی کے منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کو دلی کے چاندنی چوک میں ایک فقیر اپنی غریب الوطنی کا رونا روتے نظر آیا۔ وہ شکایت کر رہا تھا کہ اُس کا کوئی دوست نہیں۔ مصنف نے اکثر اُمور میں فقیر کو اپنے سے اچھا پایا۔ مصنف اپنے دل میں باتیں کرتا ہے کہ فقیر کتنا خوش قسمت آدمی ہے، کہتا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص یہیں تو مجھ سے بڑھ گیا ہے میرے اتنے دوست ہیں کہ دن بھر پانچ منٹ کی بھی فرصت نہیں دیتے۔ اپنے مکان پر مضمون لکھنے جا رہا ہوں مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انھیں اطمینان سے قلم بند کر سکوں۔

تشریح:

اس افسانے میں سجاد حیدر یلدرم نے اُن دوستوں پر طنز کی ہے جو وقت کے ضیاع کا باعث بنتے ہیں۔ انسان گروہی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اس کی ضروریات کی نوعیت ایسی ہے کہ اکیلا رہ کر انسان انھیں پورا نہیں کر سکتا۔ مل جل کر رہنے میں ایک انسان کے دوسرے انسانوں سے مختلف نوعیت کے رشتے تشکیل پاتے ہیں۔ ان میں خونی رشتے بھی ہوتے ہیں ماں باپ، بہن بھائی، اولاد، جذبہ و احساس کی بنیاد پر دوستی، دشمنی محبت، نفرت اور ضرورت کے رشتے بھی۔ انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ اچھے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑے۔ ایسے لوگ جو مصیبت میں اس کے کام آئیں۔ دوست کی تو تعریف بھی یہ کی جاتی ہے کہ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔ لیکن یہ رشتہ بھی بعض اوقات دردِ سر بن جاتا ہے۔ مصنف سوچتا ہے۔ مصنف کو وہ فقیر خود سے بہتر معلوم ہوتا ہے جو غریب الوطنی اور دوست نہ ہونے کی فریاد کر رہا تھا۔ مصنف سوچتا ہے کہ فقیر کے دوست نہیں، یہ واقعی خوش نصیبی کی بات ہے۔ کم از کم اُس کے دوست وقت بے وقت آکر اُسے تنگ تو نہیں کرتے نہ اُسے راستے میں ملتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ بھائی جان! دیکھو میں تمھیں پرانی دوستی کی قسم دیتا ہوں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے اس وقت پیسوں کی اشد ضرورت ہے تھوڑا سا روپیا قرض دے دو۔ کیا اس کے دوست وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ اگرچہ اس کا جانے کا بالکل موڈ نہ ہو۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے شدید نیند آ رہی ہو مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور وہاں سے جانے کا نام تک نہیں لیتے۔

کیا اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اُس کے کسی پیارے دوست کی لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور اُس پر اپنی رائے کا اظہار کرنا پڑے۔ کیا اُسے اپنے دوستوں سے اکثر ملاقات کو جانا نہیں پڑتا؟ اور اگر نہ جائے تو دوستوں کے غصے اور شکایت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اگر وہ ان سب باتوں سے آزاد ہے اور اُسے کوئی فکر لاحق نہیں تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ وہ مضبوط اور طاقت ور ہے اور میں کمزور اور لاچار۔ یا اللہ وہ اس پر بھی شکر ادا نہیں کرتا خدا جانے وہ کون سی نعمت چاہتا ہے؟

مصنف سوچتا ہے کہ فقیر کو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس کے ایسے دوست نہیں جو اس کے لئے پریشانی کا باعث بنیں۔ فقیر وبال جان دوستوں کی نعمت سے محروم ہے تو خدا کا شکر ادا کرے، نہ جانے اُسے خدا کی طرف سے کس کرم وعنایت کی توقع ہے؟

اقتباس2:

بادلِ ناخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجا طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شین نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انھیں دِکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا، جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا، خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سرِ نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ بہ ہزار دقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا، جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا۔

سبق کا عنوان: مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ **مصنف کا نام:** سجاد حیدر یلدرم

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
بادلِ ناخواستہ	نہ چاہتے ہوئے	یک سو	مکمل توجہ
بہ ہزار دقت	بڑی مشکل سے	از سرِ نو	نئے سرے سے

تشریح:

اس سبق میں مصنف سجاد حیدر یلدرم نے دوستوں کے اُس رویے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس سے کسی بھی مصروف انسان کے معمولات پر منفی اثر پڑتا ہے۔ مصنف کے دوست شاکر خان صاحب مصنف کو اپنے ساتھ سلیم پور اس لیے لے کر گئے کہ وہاں کی تازہ آب وہوا اور کھلے ماحول میں مصنف انہماک کے ساتھ مضمون نگاری کر سکے۔ لیکن وہاں پہنچ کر نہ مصنف کو سکون ملا اور نہ یکسوئی سے کام کرنے کے لیے تنہائی میسر آئی۔ ایک دن مصنف مضمون لکھنے میں مصروف تھا کہ شاکر خان صاحب کا ملازم اُسے بلانے آیا کہ آپ نیچے تشریف لائیں سرکار آپ کو کسی سے ملانا چاہتے ہیں۔

مصنف نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجا طالب علی تشریف لائے تھے ان سے مصنف کا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے۔ مصنف کہتا ہے کہ مجھے کچھ فرصت ملی اور میں توجہ سے لکھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شبن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی ہے ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہیں میں انھیں دکھایا جاؤں گا گویا میں بھی اُس عربی گھوڑے کی مانند تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر آنے والے دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوستوں سے چھٹکارا

پاکر اور بھاگ کر میں اپنے کمرے میں آیا خیالات غائب ہو چکے تھے۔ فقرہ نئے سرے سے پھر بنانا پڑا۔ طبیعت بیزار ہو گئی ہزار کوشش اور مشکل کے بعد پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ کوئی بھی تخلیقی کام کرنے کے لیے انسان کو ذہنی یک سوئی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ خیالات کے اظہار میں نظم وضبط اور ترتیب موجود رہے۔ انسان اپنا مافی الضمیر واضح انداز میں بیان کر سکے۔ دوسری صورت میں فکر و فن کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ خیالات کے بیان میں اگر بے ترتیبی آجائے تو سارا تخلیقی عمل بے کار ثابت ہوتا ہے۔ وہی لوگ فکری کارنامے سر انجام دینے میں کامیاب ہوتے ہیں جنھیں ذہنی سکون اور یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کا موقف ہے کہ اس دفعہ خوش قسمتی سے کوئی آدھا گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا۔

مشق

1-سوالات کے مختصر جوابات

(الف) چاندنی چوک میں فقیر کی تقریر کا لُبِ لُباب کیا تھا؟

جواب: بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں، میرا کوئی دوست نہیں۔ ہائے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خدا کے بندو! میری سنو، میں غریب الوطن ہوں۔

(ب) مصنف پر اس فقیر نے کیا اثر کیا؟

جواب: مصنف اس عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے، وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں۔ میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں"۔ اس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے، تو اُسے مبارک باد دینی چاہیئے۔

(ج) مصنف کو اپنے بے تکلف دوست بھڑ بھڑیا سے کیا شکایت ہے؟

جواب: مصنف کو یہ شکایت ہے کہ حضرت کی خِلقت میں داخل ہے کہہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے، شور مچاتے ہوئے، چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔

(د) محمد تحسین کی گفتگو کا محور کیا ہوتا ہے؟

جواب: ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔

2-سبق کے متن کو مد نظر رکھ کر درست جوابات کی نشاندہی کریں۔

(الف) آفت کا مارا فقیر کتنے بچوں کا باپ تھا؟

(الف) تین (ب) پانچ (ج) ✓ سات (د) نو

(ب) مصنف نے کس مصیبت کو فقیر کے لیے نعمت تصور کیا ہے؟

(الف) روٹی کی محتاجی (ب) ✓ دوست نہ ہونا (ج) غریب الوطنی (د) بھیک مانگنا

(ج) مصنف نے کس دوست کو بھڑ بھڑیا دوست کہا ہے؟

(الف) محمد تحسین کو (ب) ✓ احمد مرزا کو (ج) قرض خواہ دوست کو (د) مقدمے باز دوست کو

(د) شاکر صاحب مصنف کو لے گئے:

(الف)✓ سلیم پور (ب)دِلی (ج)جے پور (د)شاہ پور

(ہ)مصنف کا دوست زیادہ بے تکلف اور شور مچانے والا ہے۔

(الف)✓ احمد مرزا (ب)شاکر صاحب (ج)قرض خواہ دوست (د)محمد تحسین

(و)مصنف کے دوست انہیں راجہ صاحب سے ملوانے کہاں لے جانا چاہتے تھے؟

(الف)جام نگر (ب)✓احمد نگر (ج)الہ آباد (د)احمد آباد

(ز)مصنف جس کمرے میں ٹھہرائے گئے اس کی کھڑکی کھلتی تھی:

(الف)باغ میں (ب)چٹیل میدان کی طرف (ج)✓ پائیں باغ میں (د)دریا کی سمت

3-متن کی روشنی میں درست لفظ چن کر خالی جگہ پُر کیجئے۔

(الف) چاندنی چوک میں صدا لگانے والا فقیر ——— تھا۔(بھوکا، بیمار، ✓غریب الوطن)

(ب) احمد مرزا کی فطرت ہے کہ وہ ———۔(اپنی ہی تعریف کریں، ✓نچلانہ بیٹھیں، چڑچڑے پن کا مظاہرہ کریں)

(ج) مصنف کو لکھنے پڑھنے سے منع کرنے والے دوست کا نام ——— ہے۔(احمد مرزا، محمد تحسین، ✓شاکر خاں)

(د) احمد نگر کے رئیس کا نام ——— ہے۔(شاکر خان، احمد علی، ✓طالب علی)

(ہ) میرے ——— دوست کا نام شاکر خاں ہے۔(✓ادب پسند، مقدمے باز، شکاری)

4-سبق کے متن کو مد نظر رکھ کر درست یا غلط کی نشاندہی کریں۔

(الف)-چاندنی چوک میں ایک بدصورت فقیر صدا لگا رہا تھا۔	درست / غلط ✓
(ب)-فقیر کے پاس سب کچھ تھا، اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔	درست / غلط ✓
(ج)-احمد مرزا کو مصنف نے "بھڑ بھڑیا" کا نام دیا ہے۔	✓درست / غلط
(د)-شاکر خاں کے ہاں سیاہی کی دوات خشک اور قلم بغیر نب کے تھا۔	✓درست / غلط
(ہ)-شاکر خاں کے بھائی کو موسیقی سے نفرت تھی۔	درست / غلط ✓

5-سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح کریں۔

6-اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

7-مندرجہ ذیل تراکیب اور محاورات کو اپنے الفاظ میں استعمال کیجئے۔

الفاظ	**جملے**
لفظ بہ لفظ	عامر کو کتاب لفظ بہ لفظ یاد تھی۔

نحیف و نزار	بیماری کے دوران میرا دوست نحیف و نزار تھا۔
زندگی دوبھر ہونا	مہنگائی نے عوام کی زندگی دوبھر کر دی ہے۔
نچلا نہ بیٹھنا	حسن دو منٹ بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔
کلیجے پر پتھر رکھنا	ماں نے کلیجے پر پتھر رکھ کر بیٹے کو جنگ کے لئے روانہ کیا۔
شایان شان	یہ عہدہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔
ماتھا ٹھنکنا	میرا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔
رطبُ اللسان	زاہد اللہ کی ثنا میں رطب اللسان تھا۔

8 - ملمّع

ہاجرہ مسرور

خلاصہ

ہاجرہ مسرور مشہور افسانہ نگار تھیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے خواتین کے مسائل اور چھوٹی بڑی معاشرتی الجھنوں اور طبقاتی فرق کی بنیاد پر اٹھنے والے مسائل پر مبنی ہیں۔ افسانہ ملمع میں بھی انہوں نے اصلیت پر ملمع سازی کی الجھن کو موضوع بنایا ہے۔

اس سبق میں ایک لڑکی کی منافقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ ریلوے کے ٹکٹ گھر کے سامنے سیاہ ریشمی برقعے میں حیران کھڑی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور گاڑی آنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ لیکن اس کے باوجود ٹکٹ گھر کی کھڑکیاں نہیں کھلی تھیں۔ ارد گرد سیکڑوں آدمی لاشوں کی طرح پڑے تھے۔ اس نے قلی سے ٹکٹ گھر نہ کھلنے کی وجہ پوچھی تو قلی نے اپنی دھندلی آنکھ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ گاڑی ہمیشہ لیٹ آتی ہے۔ لڑکی نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ میں کہاں بیٹھوں۔ قلی نے زمین پر بیٹھنے کو کہا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا ریشمی برقع، خوبصورت چہرہ اور نفیس سامان قلی کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ سوچ کر وہ گھبرا گئی۔ جلد ہی اس کا خیال اپنی موجودہ حالت کی طرف لوٹ آیا کہ میں کسی امیر گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہوں۔ قلی کے وہیں سامان رکھنے پر وہ غصے میں آگئی اور کہا میں یہاں نہیں بیٹھوں گی اسی دوران اندھیری سڑک سے ایک خوبصورت نوجوان بھاری اوور کوٹ پہنے اس کی طرف آرہا تھا۔ نوجوان نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور ٹکٹ گھر کے پیچھے نکل گیا۔ لڑکی نے اپنے دل میں سوچا کہ کوئی امیر زادہ ہو گا۔ بھلا وہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لینے کیوں آئے گا۔ اچانک وہی نوجوان پھر سامنے آیا اور قلی سے کہا۔ تم اسے عورتوں کے ویٹنگ روم میں کیوں نہیں لے جاتے ہو؟ لڑکی نے قلی سے کہا پھر اتنی دور سے ٹکٹ لینے کون آئے گا۔ لڑکے نے قلی سے پوچھا کہ ٹکٹ سیکنڈ کلاس کا چاہیے یا انٹر کلاس کا، یہ سن کر وہ سناٹے میں آگئی۔ ایک عجیب احساس نے اسے بے چین کر دیا اور وہ لڑکے کے بارے میں سوچنے لگی کہ جو کچھ اس نے میرے پاس دیکھا ہے، یہی میری کل کائنات ہے۔ اٹیچی کیس، ہولڈ ال، چرمی بٹوا اور برقع جو حقیقت میں اس کا نہیں ہے۔ لڑکی چچا جان کی بیماری کا خط ملتے ہی امی جان کی باتوں کی پرواہ کیے بغیر بہادری سے اکیلی ہی گھر سے چل دی تھی۔ کھانسی کی آواز سے وہ چونکی جو کہ ایک بڑھیا کی تھی جو حلیہ سے عیسائی معلوم ہو رہی تھی۔

لڑکی نے دل میں سوچا کہ کاش اس کی جگہ کوئی نوجوان لڑکی ہوتی جو اس کی طرف رشک سے دیکھتی. قلی نے اندر آکر بتایا کہ ٹکٹ گھر کھل گیا ہے تو اس نے ڈرتے ڈرتے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا کہ کہیں اسے وہ نوجوان لڑکا نہ دیکھ لے، جونہی گاڑی پلیٹ فارم پر آئی تو اس کی پہلی نظر اسی نوجوان پر پڑی۔ لڑکی جلدی سے زنانے ڈبے کے قریب پہنچ گئی۔ اسے ہر طرف سے عورتوں کی کاوں کاوں، زیورات کی جھنکار کے ساتھ ساتھ مردوں کی ہدایات کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہجوم کو چیر کر وہ دوبارہ پلیٹ فارم پر چلنے لگی اور سیکنڈ کلاس زنانہ ڈبے میں داخل ہو گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے میلے کچیلے برقعے غباروں کی طرح اڑ رہے تھے۔ لڑکی نے قلی کو اٹھنی دے کر رخصت کیا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکا اسے تاک رہا ہے۔ گاڑی نے اپنی منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ہر چیز اس کی نظروں سے پیچھے چھوٹ رہی تھی۔ اس کے ڈبے میں ہر کوئی اپنے کام میں مصروف نظر آیا۔ لڑکی کو یہ فکر ستائے جا رہی تھی کہ کوئی اس کا ٹکٹ دیکھے تو اسے اس خیال سے پھریریاں آنے لگیں۔

آخر اس ملمع کا کیا فائدہ۔ دنیا میں امیر غریب سبھی لوگ ہوتے ہیں۔ بھلا نوجوان سے متاثر ہونے کی وجہ؟ جو یہی سوچ رہی تھی کہ گاڑی اسٹیشن پر رکی اور اس نے جلدی سے اپنا سامان پلیٹ فارم پر لڑھکا دیا۔ لڑکی اتری اور اس نے الوداعی نظر نوجوان پر ڈالی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے مفلسی کو اس امیر نوجوان سے چھپا لیا۔ اتفاقاً وہ نوجوان بھی اسی پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اسے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ٹی ٹی کو دکھاتے ہوئے شرمندگی ہوئی، وہ تانگے پر بیٹھ کر رو دی کہ اس کا بھید کھل گیا تھا کہ اس نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر انٹر زنانہ میں سفر کیا تھا۔ جب وہ چچا کے گھر پہنچی تو اس کا پُر جوش استقبال کیا گیا۔ اسے چائے کڑوی دوا معلوم ہوئی اور وہ دھوپ کھانے چھت پر چلی گئی۔ اس کے پیچھے اس کی چچازاد بہن بھی آ گئی۔ لڑکی نے پڑوس کے مکان میں دیکھا کہ کوئی چارپائی پر تہمند باندھے اوندھا پڑا ہے۔ اچانک اس نے کروٹ لی تو لڑکی نے دیکھا کہ وہی اسٹیشن کا امیر زادہ ہے۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور نوجوان نے کروٹ بدل لی۔ لڑکی نے اپنی چچازاد بہن سے دریافت کیا کہ اس مکان میں کون رہتا ہے۔ اس کی چچازاد بہن نے بتایا کہ ایک بیوہ رہتی ہے اور اس کا لڑکا شہر میں پڑھتا ہے۔ بڑی سیدھی عورت ہے ہمارے ہاں کے سارے کپڑے یہی سیتی ہے۔

لڑکی سورج کے رخ پر کھڑی برقعے کو گھور رہی تھی اور اس پر نہ صرف اپنی بلکہ اس امیر زادے کی حقیقت بھی آشکار ہو گئی تھی۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا اور وہ خاموشی سے نیم تاریک سی کالی کلوٹی سڑک کی طرف دیکھنے لگی، جس پر اِکّا دُکّا چرخ چوں کرتے ہوئے یکّے کی میلی چمنیوں والی بتیوں سے ایک کثیف سی روشنی نکل کر سڑک پر رینگ رہی تھی۔ اس کا خیال فوراً ہی اپنی موجودہ حالت کی طرف دوڑ گیا۔ میں کیا ہوں اس وقت؟ دیکھنے والوں کی نظر میں یقیناً کوئی امیر کبیر آزاد خیال لڑکی لیکن درحقیقت ایک مٹے ہوئے خاندان کی قابل........ لیکن پریشان حالی لڑکی بالکل یکّے کی دھندلی لالٹین۔

سبق کا عنوان: ملمع **مصنفہ کا نام:** ہاجرہ مسرور

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
کالی کلوٹی	سیاہ رنگ کی	اِکّا دُکّا	کوئی کوئی
کثیف	میلا، گندہ	امیر کبیر	بہت زیادہ دولت مند

سیاق وسباق:

ہاجرہ مسرور مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے خواتین کے مسائل اور چھوٹی بڑی معاشرتی الجھنوں پر مبنی ہیں۔ افسانہ ملمع میں بھی انھوں نے اصلیت پر ملمع سازی کی الجھن کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے میں ہاجرہ مسرور نے ایک غریب لڑکی کو موضوع بنایا ہے جو رات کے ساڑھے گیارہ بجے ایک لڑکی ریلوے اسٹیشن پر بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ رہی تھی اس کے پاس تین روپے تھے چرمی بٹوہ تھا اور ریشمی برقع خالہ کا لے کر پہن رکھا تھا۔ اُس نے ٹکٹ خرید کر بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی قُلی نے اُس کا سامان اُٹھا رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو امیر ظاہر کرتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی لیکن اُس کا برقع، خوبصورت چہرہ اور نفیس سامان غریب قُلی کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا

تشریح طلب اقتباس اسی موقع سے لیا گیا ہے۔

تشریح:

ہاجرہ مسرور مشہور افسانہ نگار تھیں اُن کے زیادہ تر افسانے خواتین کے مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں اور چھوٹی بڑی معاشرتی الجھنوں اور طبقاتی فرق کی بنیاد پر اٹھنے والے مسائل پر مبنی ہیں۔ افسانہ ملمع میں بھی انھوں نے اصلیت پر ملمع سازی کی الجھن کو موضوع بنایا ہے جس میں انسان اصلیت کو چھپا کر مصنوعی زندگی کا انداز اپناتا ہے۔

سبق میں ایک لڑکی کی دو مختلف سطحوں پر گزرنے والی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ وہ ریلوے اسٹیشن پر ریلوے ٹکٹ گھر کے سامنے سیاہ ریشمی برقعے میں ملبوس حیران کھڑی ہے۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور گاڑی آنے میں پندرہ منٹ باقی تھے لیکن اس کے باوجود ٹکٹ گھر کی کھڑکیاں ابھی تک نہ کھلی تھیں۔ اس کے ارد گرد بہت سارے لوگ لاشوں کی طرح پڑے تھے اس نے قلی سے ٹکٹ گھر نہ کھلنے کی وجہ پوچھی تو قلی نے اپنی دھندلی آنکھ سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ گاڑی ہمیشہ لیٹ آتی ہے۔ لڑکی نے اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے کہا کہ میں کہاں بیٹھوں۔ قلی نے اُسے زمین پر بیٹھنے کو کہا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا ریشمی برقع اور خوبصورت چہرہ اور نفیس سامان قُلی کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ سوچ کر وہ گھبرا گئی اور جلد ہی اپنی موجودہ حالت کی طرف لوٹ آئی کہ میں تو کسی امیر گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہوں قُلی کے وہیں سامان رکھنے پر وہ غصے میں آگئی اور کہا میں یہاں نہیں بیٹھوں گی۔ جب اُس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تو اس خیال ہی سے اُس کا دل بہت پریشان ہو گیا وہ خاموشی کے ہلکے اندھیرے میں سیاہ رنگ کی سڑک کو دیکھنے لگی جس پر کوئی کوئی لوگ اور تانگوں کی چوں چرخ کی آوازیں ماحول میں ارتعاش کی وجہ بنتی تھیں۔ تانگے کی گندی میلی چمنیوں والی روشنیوں کی لال ٹینوں سے ایک ہلکی دھندلی اور گندی سی روشنی نکل کر سڑک پر آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ اس کی سوچ کا دائرہ اچانک اپنی موجودہ حالت کی طرف پھیل گیا اور وہ اپنی اس وقت کی حالت یعنی امیرانہ انداز پر غور کرنے لگی۔ میں اس وقت کس حیثیت کی مالک ہوں یعنی ایک بہت ہی زیادہ امیر نظر آنے والی لڑکی اور آزاد خیال یعنی جدید سوچ کی مالک جو رات کو بھی اکیلے سفر کر سکتی ہے اور آزادی کے ساتھ کہیں بھی جا سکتی ہے لیکن اصل میں ایک تباہ شدہ خاندان کی ایک لائق اور اہم لڑکی جس کی کوئی برابری نہیں کر سکتا لیکن درحقیقت ایک غریب اور مٹے ہوئے خاندان کی انتہائی پریشان حال لڑکی ایسے ہی جیسے تانگے کی مدھم دھندلی اور کثیف روشنی کا آلہ۔ سفر کے دوران اُس کو ایک لڑکا نظر آتا ہے جو اُسے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھی غریب ہوتا ہے اور اُس نے امیرانہ انداز اپنا رکھا ہے لڑکی کو اپنا تھرڈ کلاس ٹکٹ (ٹی ٹی) ٹکٹ چیکر کو دکھاتے ہوئے شرمندگی ہوئی۔ چچا کے گھر پہنچ کر اُس لڑکے کی اصلیت کھل گئی کہ وہ انتہائی غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ لڑکی اور لڑکے دونوں کا ملمع اُتر چکا تھا۔

ہاجرہ مسرور کا افسانہ پڑھ کر قاری کا دھیان غلام عباس کے افسانے "اوور کوٹ" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "گھر سے گھر تک" کی طرف چلا جاتا ہے۔ اصل میں طبقاتی معاشرے میں افراد کے درمیان ایک مقابلے کی کیفیت ہوتی ہے وہ دوسروں کے سامنے بہتر سے بہتر نظر آنے کی دوڑ میں شامل ہوتے ہیں۔ ایسے میں بعض اوقات وہ اپنے آپ کو اپنی سماجی حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اور نہ جانے کیسے کیسے سنہرے خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن پھر کوئی واقعہ انہیں حقیقی دنیا میں واپس لے آتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی اور تلخ محسوس ہونے لگتی ہے۔

اس نثر پارے میں بتایا گیا ہے کہ کسی کے ظاہر سے اُس کے باطن کا اندازہ لگانے والے ہمیشہ غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں کسی کی ظاہری حالت اُس کی حیثیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ ظاہری حلیہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ جب حقیقت میں ملمع کا پردہ چاک ہوتا ہے تو سوائے شرمندگی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اقتباس 2:

گوبر سے لپے پتے آنگن میں بانس کی کھری چارپائی پر کوئی تہبند باندھے اوندھا پڑا دھوپ لے رہا تھا۔ چارپائی پر سرہانے کی طرف بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیا رکھی ہوئی تھی۔ پھونس کے چھپر میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں تھوپ رہی تھی۔ دھوپ کھانے والے نے کروٹ بدلی اور لڑکی کا دل دھڑکتے دھڑکتے جیسے ایک لمحہ کے لیے تھک گیا ہو۔

سبق کا عنوان: مُلمع **مصنفہ کا نام:** ہاجرہ مسرور

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	**معانی**
آنگن	گھر کے اندر کا صحن
ادھیڑ عمر	ڈھلتی عمر، متوسط عمر
بیڑی:	سگریٹ۔ سوکھے پتے میں تمباکو بھری مخروطی بتی جسے چوڑی طرف سے سلگا کر پتلی طرف سے کش لگاتے ہیں۔
اوندھا:	منہ کے بل لیٹا ہوا۔ چت کی ضد

تشریح:

ہاجرہ مسرور مشہور افسانہ نگار تھیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے خواتین کے مسائل اور چھوٹی بڑی معاشرتی الجھنوں اور طبقاتی فرق کی بنیاد پر اٹھنے والے مسائل پر مبنی ہیں۔ افسانہ ملمع میں بھی انھوں نے اصلیت پر ملمع سازی کی الجھن کو موضوع بنایا ہے۔

زیر تشریح اقتباس میں مصنفہ کہتی ہیں کہ لڑکی کو اپنی اصلیت کھل جانے کا بے انتہا کرب تھا کہ نفیس سامان اور سیکنڈ کلاس میں سفر کے باوجود، تھرڈ کلاس کا ٹکٹ مجبوراً دکھانے پر اس کی ایک خوش پوش نوجوان کے سامنے بے عزتی ہو گئی جو اسی کے سوار ہونے کے اسٹیشن سے اس کی گاڑی پر سفر کر رہا تھا اور اب اس کی منزل مقصود اسٹیشن پر اترا بھی تھا۔ اسے گمان نہیں تھا کہ اس نے ملمع کر کے اپنی حالت ظاہر کی تھی اس کا بھید کھل جائے گا۔ وہ چچا کے گھر کی چھت پر اسی پچھتاوے اور افسوس میں ٹہل رہی تھی کہ اس کی نظر پڑوس کی ایک جھونپڑی کے صحن میں پڑی۔ سارا صحن جانوروں کے گوبر سے لپا پتا تھا۔ صحن میں بانس کی کھردری چارپائی پر کوئی بدن کے نچلے حصے پر کپڑا لپیٹے منہ نیچے کر کے دھوپ الاپ رہا تھا۔ سردیوں میں حرارت حاصل کرنے کے لیے دھوپ میں بیٹھا اور لیٹا جاتا ہے۔ چارپائی پر سرہانے کی طرف سگریٹ کا بنڈل اور ماچس کی ڈبیا رکھی تھی۔ گھاس پھونس کے سائبان میں ایک ڈھلتی عمر کی عورت بیٹھی باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں بنا رہی تھی۔ شاید دھوپ الاپنے والے کے کھانے کے لیے تیاری کی جا رہی تھی۔ دھوپ کھانے والے نے پہلو بدلا اور سیدھا لیٹ گیا۔ لڑکی کی نگاہیں اس کو پہچان چکی تھیں۔ وہ ہکا بکا رہ گئی کہ یہ تو وہی امیر زادہ تھا جس کے سامنے اس کی تصنع کا پردہ چاک ہوا تھا اب اس لڑکے کی اصلیت کا ملمع بھی اتر چکا تھا اور حقیقت اس کی آنکھوں کے سامنے فقیرانہ آنگن میں لیٹی اپنی اصلیت بتا رہی تھی۔ ہاجرہ نے اس حقیقت کو اُجاگر کیا ہے کہ ظاہر کے لبادے سے اصلیت نہیں چھپائی جا سکتی۔

ہاجرہ مسرور کا افسانہ پڑھ کر قاری کا دھیان غلام عباس کے افسانے "اوور کوٹ" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "گھر سے گھر تک" کی طرف چلا جاتا ہے۔ اصل میں طبقاتی معاشرے میں افراد کے درمیان ایک مقابلے کی کیفیت ہوتی ہے وہ دوسروں کے سامنے بہتر سے بہتر آنے کی دوڑ میں شامل ہوتے ہیں۔ ایسے میں بعض اوقات وہ اپنے آپ کو اپنی سماجی حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اور نہ جانے کیسے کیسے سنہرے خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن پھر کوئی واقعہ انھیں حقیقی دنیا میں واپس لے آتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی اور تلخ محسوس ہونے لگتی ہے۔

اقتباس 3:

"باجی! یہ برقع تو بڑا اچھا سا بنا ڈالا تم نے۔" وہ اس کا برقع بھی نیچے سے مارے شوق کے اٹھا لائی تھی لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ سورج کے رُخ پر کھڑی ہو کر برقع کو قہر آلودہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر لمبی چوڑی چھت پر مضطربانہ ٹہلنے لگی۔ اسے برقعے کی تعریف ہوتے ہی سفر کے سارے واقعات رہ رہ کر یاد آنے لگے، جنہیں وہ دل سے محو کر دینا چاہتی تھی۔

سبق کا عنوان: ٹُلّع **مصنفہ کا نام:** ہاجرہ مسرور

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	**معانی**
مارے شوق کے	لگن کی وجہ سے / شوق کی وجہ سے کیا چیز کی شدید چاہت
قہر آلودہ	غضبناک / غصے سے بھرپور
مضطربانہ	بے چینی سے / اسے قراری سے
محو کر دینا	بھلا دینا / مٹا دینا / دور کر دینا

تشریح:

ہاجرہ مسرور نے اس افسانے میں ایک بہت بڑی حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے۔ انسان اپنے اوپر بناوٹ کا لبادہ اوڑھ کر اپنی اصلیت کو بھول جانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد دوسروں کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ دوسروں کی چکا چوند میں خود بھی ویسا ہی بننا چاہتا مگر یہ بھول جاتا ہے کہ دوسرے بھی اسی دنیا کے باسی ہیں۔

لڑکی کا اپنا برقع گو قیمتی تھا مگر مانگے کا تھا اور اصل میں وہ لڑکی انتہائی غریب تھی اس نے محض ایک قیمتی اوور کوٹ کی وجہ سے نوجوان کو بھی کوئی امیر زادہ سمجھ لیا تھا حالانکہ وہ بھی ایک غریب بیوہ کا لڑکا تھا جو اُس کے چچا کے گھر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ میکسم گورکی اپنے ایک افسانے میں لکھتا ہے کہ۔۔۔"لوگوں کی اکثریت زندگی گزارنے کی تیاریوں میں ساری زندگی گزار دیتی ہے۔۔۔۔"

ہاجرہ مسرور کا افسانہ پڑھ کر قاری کا دھیان غلام عباس کے افسانے "اوور کوٹ" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "گھر سے گھر تک" کی طرف چلا جاتا ہے۔ اصل میں طبقاتی معاشرے میں افراد کے درمیان ایک مقابلے کی کیفیت ہوتی ہے وہ دوسروں کے سامنے بہتر سے بہتر نظر آنے کی دوڑ میں شامل ہوتے ہیں۔ ایسے میں بعض اوقات وہ اپنے آپ کو اپنی سماجی حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اور نہ جانے کیسے کیسے سنہرے خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن پھر کوئی واقعہ انہیں حقیقی دنیا میں واپس لے آتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی اور تلخ محسوس ہونے لگتی ہے۔

لڑکی کے چچا کی بیٹی نے اُس کا قیمتی برقع دیکھا تو بہت زیادہ متاثر ہوئی اُس وقت وہ لڑکی چھت پر تھی اُس کے چچا کی بیٹی انتہائی شوق کی وجہ سے وہ برقع بھی چھت پر لے آئی اور لڑکی سے کہنے لگی۔ باجی! یہ برقع تو آپ نے بہت ہی اچھا بنایا ہے اور برقع پہن کر اپنا شوق پورا کرنے لگی کیوں کہ وہ بہت ہی غریب لڑکی تھی۔ مہمان لڑکی نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کوئی جواب نہ دیا اور سورج کی طرف اپنا چہرہ کر کے برقع کو انتہائی غضبناک نظروں سے دیکھنے لگی وہ کسی الجھن کا شکار دکھائی دیتی تھی پر وسیع و عریض گھر کی چھت پر بڑی ہی بے چینی اور بے قراری سے چہل قدمی کرنے لگی۔ جیسے ہی میزبان لڑکی نے برقعے کی تعریف کی۔ ریل گاڑی کے سفر کے واقعات رہ رہ کر اُس کے ذہن کے صفحہ قرطاس پر بکھرنے لگے، رات کے ساڑھے گیارہ بجے سیاہ ریشمی برقعے میں ملبوس ٹکٹ خریدنا، قلی کے ساتھ تکرار، نوجوان کا ملنا، تھرڈ کلاس ٹکٹ خرید کر، سیکنڈ کلاس زنانہ میں سوار ہونا، امیروں کی طرح انداز اپنانا، ناک بھوں چڑھانا، ریل گاڑی میں عورتوں کا بے ہنگم شور، نوجوان کو متاثر کرنے کی کوشش، سامان پلیٹ فارم پر لڑھکانا اور نوجوان پر الوداعی نظر ڈالنا اور خوش ہونا کہ اُس نے اپنی غربت کو چھپالیا۔ چچا کے گھر پہنچ کر چائے کو کڑوی

دوا سمجھ کر پینا اور چھت پر دھوپ کھانے کے لیے جانا، غرض ہر ایک منظر تیزی سے اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا اور وہ ان سب واقعات کو اپنے ذہن سے بھلا دینا چاہتی تھی لیکن زندگی بہتر گزارنے کی آرزو زندگی کو بعض اوقات مزید تلخ کر دیتی ہے۔

مشق

1- سوالات کے مختصر جوابات

(الف) قلی نے لڑکی کو پلیٹ فارم پر بیٹھ جانے کے لیے کہا تو اس پر لڑکی نے کس رویے کا اظہار کیا؟

جواب: قلی نے لڑکی کو پلیٹ فارم پر بیٹھ جانے کے لیے کہا تو اس پر لڑکی نے ناگواری کا اظہار کیا۔

(ب) لڑکی سفر کیوں کر رہی تھی؟

جواب: لڑکی چچا جان کی بیماری کا سن کر ان کی مزاج پرسی کے لئے سفر کر رہی تھی۔

(ج) گھر والوں نے عقیل کو ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا تو اس پر لڑکی نے کیا جواب دیا؟

جواب: گھر والوں نے عقیل کو ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا تو لڑکی نے جواب دیا کہ میں کوئی لڈو پیڑا ہوں جو کوئی کھالے گا اور عقیل کو دیکھ کر ڈر کے مارے اگل دے گا۔ آخر سلمٰی اور رضیہ بھی تو لڑکیاں ہیں کیسے مزے میں تنہا سفر کرتی ہیں۔

(د) لڑکی اسٹیشن پہنچی تو اس نے سب سے پہلے کیا دیکھا؟

جواب: لڑکی اسٹیشن پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ٹکٹ گھر کی کھڑکیاں بند ہیں اور سیکڑوں آدمی لاشوں کی طرح پڑے سو رہے ہیں۔

(ہ) لڑکی جس ڈبے میں سوار ہوئی، اس کا ماحول کیسا تھا؟

جواب: لڑکی کے ڈبے میں دو عورتیں رنگین لحافوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور ارد گرد بھاری بکس اور پوٹلیاں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ کسی کے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ تیسری سیٹ پر کونے میں ایک عورت بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور اس کے قریب دوسرا بچہ جو انتہائی کمزور تھا، پڑا ہوا تھا۔

2- سبق کے متن کو مد نظر رکھ کر درست جوابات کی نشاندہی کریں۔

(الف) سبق "ملمع" کے مآخذ کا نام کیا ہے؟

(الف) وہ لوگ (ب) ✓ سب افسانے میرے (ج) ہائے اللہ (د) چوری چھپے

(ب) جب لڑکی ریلوے اسٹیشن پہنچی تو گاڑی آنے میں دیر تھی:

(الف) ✓ پندرہ منٹ (ب) آدھا گھنٹہ (ج) ایک گھنٹہ (د) چند منٹ

(ج) سبق "ملمّع" اصناف ادب کے لحاظ سے کیا ہے؟

(الف) داستان (ب) ✓ افسانہ (ج) مضمون (د) ناول

(د) "ملمّع" کس کی تحریر ہے؟

(الف) خدیجہ مستور (ب) ✓ ہاجرہ مسرور (ج) سجاد حیدر یلدرم (د) اشرف صبوحی

(ہ) لڑکی نے قلی کو کتنی رقم دی؟

(الف)✓ اَٹھنّی (ب) ایک روپیا (ج) پانچ کا نوٹ (د) دس روپے

(و) لڑکی کے سفر کا مقصد تھا:

(الف) سیر سپاٹا (ب)✓ بیمار چچا کی عیادت (ج) خالہ زاد بہن کی شادی میں شرکت (د) چھٹیاں گزارنا

(ز) لڑکی نے ریل کا سفر کس درجے میں کیا؟

(الف)✓ انٹر (ب) اوّل (ج) دوم (د) اے سی

3- لڑکی پر امیر زادے کی اصلیت کیسے واضح ہوئی؟

جواب: لڑکی اپنے چچا کے گھر کی چھت پر ٹہل رہی تھی وہ سفر کے واقعات کو بھلا دینا چاہتی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے پڑوسن کے گھر جھانکا اور دیکھا کہ گوبر سے لپے پتے آنگن میں بانس کی کھری چارپائی پر کوئی تہ بند باندھے اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اچانک اس نے کروٹ بدلی۔ یہ تو وہی امیر زادہ تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور لڑکے نے دوبارہ کروٹ بدل لی۔ اس طرح اس پر امیر زادے کی اصلیت واضح ہو گئی۔

4- سبق کے متن کو مد نظر رکھ کر درست یا غلط کی نشاندہی کریں۔

(الف)- " گاڑی ہمیشہ لیٹ رہتی ہے "۔ قلی نے کہا۔	✓ درست / غلط
(ب)- لڑکی کو ماموں کی بیماری کا خط ملا تھا۔	درست / غلط ✓
(ج)- قلی ایک روپے کا سکہ پا کر خوش ہو گیا۔	درست / غلط ✓
(د)- چچا کے ہاں لڑکی کا استقبال خوشی سے کیا گیا۔	✓ درست / غلط

5- اُردو میں اسم کی بلحاظِ جنس دو قسمیں ہیں، مذکر اور مونث۔ یعنی ہر اسم، چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان، مذکر ہو گا یا مونث۔ اگرچہ ماہرینِ قواعد نے تزکیر و تانیث کے کچھ اصول بنائے ہیں لیکن عام طور پر تزکیر و تانیث اہل زبان کے بول چال ہی کے تابع ہوتے ہیں اور بے جان اسموں کی تذکیر و تانیث کے سلسلے میں بھی اہل زبان کی گفتگو ہی سند قرار پاتی ہے۔

مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے۔

برقع، قلی، سڑک، لالٹین، لب، پیشانی، فرض، سائنس، گدڑی

جوابات:

الفاظ	جملے
برقع	لڑکی نے ریشمی برقع پہن رکھا تھا۔
قلی	قلی نے آموں کا ٹوکرا اٹھایا۔
سڑک	سڑک بہت ویران تھی۔
لالٹین	بہت اندھیرا تھا اس لیے اس نے لالٹین جلا دی۔
لب	نازکی اس کے لب کی کیا کہیے۔

پیشانی	میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔
فرض	اپنا فرض نیک نیتی سے ادا کرو۔
سائنس	میں موبائل کی ساری سائنس جانتا ہوں۔
گدڑی	فقیر نے پھٹی پرانی گدڑی پہن رکھی تھی۔

6-اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

7-سیاق وسباق کے حوالے سے نثر پاروں کی تشریح کریں۔

9 ۔ چغل خور

شفیع عقیل

خلاصہ

شفیع عقیل اُردو کے مشہور ادیب تھے۔ اُن کا زیادہ تر کام لوک داستانوں پر مشتمل ہے۔ سبق "چغل خور" میں انہوں نے چغل خوری کی فتنہ پروری کو اُجاگر کیا ہے۔

پرانے زمانے کی بات ہے کہ کسی گاؤں میں ایک چغل خور رہتا تھا۔ اس نے اپنی اس عادت سے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ چغل خوری کی ہی وجہ سے اسے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے اور کسی بھی جگہ اسے نوکری یا مزدوری نہ ملی کیونکہ گاؤں کے لوگ اس کی بُری عادت سے واقف تھے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے یہ گاؤں ہی چھوڑ دیا تاکہ کسی دوسرے گاؤں یا شہر میں جا کر محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالے۔

جب وہ دوسرے گاؤں پہنچا تو اُسے امید کی کرن نظر آئی کیونکہ یہاں پر اُسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک کسان کے پاس گیا اور اس سے نوکری کی درخواست کی۔ کسان کو بھی ملازم کی ضرورت تھی، کسان کے پوچھنے پر چغل خور نے بتایا کہ وہ روٹی اور کپڑے کے ساتھ چھ ماہ بعد اس کی ایک چغلی کھائے گا۔ کسان نے خوش ہو کر شرط قبول کر لی اور اسے ایک مفت کا ملازم مل گیا۔

چغل خور کو جب کسان کے ہاں ملازم ہوئے چھ ماہ گزر گئے تو اس کا دل چغلی کھانے کو چاہنے لگا۔ ایک روز وہ کسان کی بیوی کے پاس گیا اور بتایا کہ تمہارا خاوند کوڑھی ہو گیا ہے اور اگر یقین نہ آئے تو اس کے جسم کو چاٹ کر دیکھ لینا کیونکہ کوڑھی کا جسم نمکین ہوتا ہے۔ پھر وہ کسان کے پاس کھیتوں میں گیا اور کہا کہ تمہاری بیوی پاگل ہو گئی ہے اور آدمیوں کو کاٹتی پھرتی ہے اگر یقین نہ آئے تو کل جب کھانا لے کر آئے تو دیکھ لینا۔ پھر وہ کسان کے سالوں کے پاس پہنچا اور کہا کہ کسان تمہاری بہن کو بہت مارتا ہے، تمہاری بہن شرم کے مارے تمہیں بتاتی نہیں ہے۔ اگر خود آنکھوں سے دیکھنا ہو تو کل دوپہر کو کھیتوں میں آکر دیکھ لینا۔ چغل خور وہاں سے سیدھا کسان کے بھائیوں کے پاس پہنچا اور کہا کہ تمہارا بھائی سخت مصیبت میں گرفتار ہے اس کے سالے ہر چوتھے روز آکر اسے خوب مارتے ہیں اور یقین دلانے کے لیے کہا کہ کل دوپہر کو کھیتوں میں آکر دیکھ لینا کہ کسان کے سالے اس سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ اس طرح چغل خور سب سے کہہ کر واپس اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو جب کسان کی بیوی کھانا لے کر کھیتوں میں آئی اور قریب ہو کر کسان کی کلائی پکڑی اور چاٹنے کے لیے منہ آگے بڑھایا کسان اچھل کر دور ہٹ گیا۔ کسان کی بیوی جونہی آگے بڑھنے لگی تو کسان کو یقین ہو گیا کہ یہ پاگل ہو گئی ہے اور کاٹتی پھرتی ہے۔ کسان نے جوتے سے پٹائی شروع کر دی۔ اسی دوران کھیت میں چھپے ہوئے کسان کے سالے باہر آئے اور کسان پر ٹوٹ پڑے۔ اسی منظر کو دیکھ کر دوسرے کھیت سے کسان کے بھائی بر آمد ہوئے اور زوروں کی لڑائی شروع ہو گئی یہاں تک کہ سب خون میں نہا گئے۔ آخر کار ساتھ والے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ بھاگ کر آئے اور بیچ بچاؤ کر کے پوچھا کہ تم یوں ایک دوسرے سے کیوں لڑ رہے ہو تو سب نے اپنی اپنی بات بتا دی۔ معلوم ہوا کہ یہ سب

چغل خور کی وجہ سے ہوا ہے۔ چغل خور کو ڈھونڈا گیا لیکن چغل خور گاؤں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ آج ہر چغل خور، چغل خور کہنے پر ناراض ہو جاتا ہے کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اس نے یہ بات تسلیم کر لی تو کسان کے سالے اور بھائی اسے چھوڑیں گے نہیں۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

کہتے ہیں وہ دن اور آج کا دن، چغل خور کا کہیں پتا نہ چل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی کوئی چغل خور یہ نہیں مانتا کہ وہ چغل خور ہے۔ دراصل اسے اس بات کا ڈر ہے کہ اگر اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ وہ چغل خور ہے تو کسان، اس کے سالے اور اس کے بھائی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے، اسی لیے ہر چغل خور، چغل خور کہنے پر ناراض ہو جاتا ہے۔

سبق کا عنوان: چغل خور **مصنف کا نام:** شفیع عقیل

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
تسلیم کر لی	مان لی	کسان	کاشت کار
چغل خور	چغلی کھانے والا / بات آگے جا کر لگانے والا	ناراض	نالاں

سیاق وسباق:

اس سبق میں چغل خوری فتنہ پرور بن جاتی ہے۔ ایک چغل خور نے ملازمت سے ہاتھ دھونے کے بعد عہد کیا کہ وہ چغلی نہیں کھائے گا لیکن باز نہ رہ سکا اور دوسرے گاؤں میں ایک کسان کے ہاں اس شرط پر ملازم ہو گیا کہ اسے چھ ماہ بعد ایک چغلی کھانے کی اجازت ہو گی۔ اس نے کسان کی بیوی کو کہا کہ کسان کوڑھی ہے۔ آج چکھ کے دیکھ لو۔ کسان کو کہا کہ بیوی پاگل ہے آج وہ تمہیں کاٹنا چاہے گی۔ کسان کے سالوں کو کہا کہ کسان تمھاری بہن کو مارے گا اور کسان کے بھائیوں کو کہا کہ کسان کے سالے اسے مارتے ہیں۔ چنانچہ بیوی نے چکھنا چاہا، شوہر نے کاٹنا سمجھا اور اسے مارا۔ سالوں نے کسان کو اور اس کے بھائیوں نے اس کے سالوں کو مارا۔ جب لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا تو پتا چلا سب کیا دھرا چغل خور کا تھا۔

تشریح:

"شفیع عقیل" صحافی اور مصنف ہیں۔ "چغل خور" ایک لوک کہانی ہے۔ لوک کہانیاں یا لوک داستانیں کسی معاشرے، تہذیب اور زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان سے جہاں محبت، ایثار اور خلوص پروان چڑھتا ہے وہاں معاشرتی رویے اور مسائل بھی اجاگر ہوتے ہیں نیز یہ نسلوں کی کردار سازی کرتی ہیں۔ زیرِ تشریح اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ جب چغل خور کی فتنہ انگیزی سے کسان اس کی بیوی، سالے اور بھائی لڑ جھگڑ کر لہولہان ہو گئے تو چغل خور رفو چکر ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن، چغل خور کا کہیں پتا نہیں چل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کوئی نہیں مانتا کہ وہ چغل خور ہے۔ لوگ آج بھی چغلی کھاتے ہیں لیکن اپنے آپ کو چغل خور تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ اگر چغل خور نے مان لیا تو کسان، اس کے سالے اور اس کے بھائی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اسی لیے ہر چغل خور، چغل خور کہنے پر ناراض ہو جاتا ہے۔ چغلی کھانا ایک قبیح فعل ہے۔ مترجم شفیع عقیل نے ایک اہم معاشرتی برائی اور عادت کو اجاگر کر کے اس کی حوصلہ شکنی کی ہے۔

فرمان رسول ﷺ ہے: "چغل خور جنت میں نہیں جائے گا"۔

چغلی کھانا ہر شعبے میں موجود ہے۔ یہ عام معاشرتی زندگی سے پیشہ ورانہ زندگی تک ہر جگہ موجود ہے۔ لوگ چغلی کھا کر فتنہ انگیزی کا باعث بنتے ہیں۔ تعلقات میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑوں کا موجب بنتے ہیں لیکن اپنی اس عادت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مترجم نے علامتی انداز میں کہا کہ اس طرح انھیں ڈر ہے کہ کسان اور اس کے سالے اور بھائی اسے چھوڑیں گے نہیں۔ ظاہر ہے اگر کوئی بھی چغل خور یہ مان لے کہ وہ چغل خور ہے تو متاثرہ تمام افراد کے سامنے اس کا جینا محال ہو جائے۔ وہ معاشرتی طور پر بدنامی کا نشان بن جائے۔ اسی لیے ہر چغل خور چغلی کھاتا بھی ہے اور اپنے آپ کو چغل خور نہیں مانتا بلکہ اسے کوئی نہ کوئی دوسرا نام دیا جاتا ہے اور اگر اس کی اصلیت اجاگر کی جائے تو ناراض ہو جاتا ہے۔ مترجم نے واضح کیا ہے کہ چغل خوری ایک لعنت ہے، فتنہ پروری ہے اور برا کام ہے اس لیے چغل خوری سے بچنا چاہیے ہیں تو جس طرح اس سبق کا چغل خور کسان اس کے بھائیوں اور سالوں سے بچتا پھر رہا ہے اسی طرح ہر چغل خور چھپتا پھرے گا۔

اقتباس2:

اگلے وقتوں کی بات ہے کسی گاؤں میں ایک چغل خور رہتا تھا۔ دوسروں کی چغلی کھانا اور ایک کی بات دوسرے سے کرنا اس کی عادت تھی اور لاکھ کوشش کے باوجود، وہ اپنی عادت کو نہ چھوڑ سکا تھا۔ اس نے بارہا اس بات کا ارادہ کیا کہ اب کسی سے کسی کی چغلی نہیں کھائے گا، ایک کی بات دوسرے سے نہیں کہے گا لیکن ہر بار وہ اپنے اس ارادے میں ناکام ہو جاتا۔ دراصل وہ اپنی عادت کی وجہ سے اُسے اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

سبق کا عنوان: چغل خور **مصنف کا نام:** شفیع عقیل

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
چغل خور	غیبت کرنے والا	بارہا	کئی بار۔
دراصل	در حقیقت	ہاتھ دھونا پڑے	محروم ہونا پڑا

تشریح:

اس لوک داستان کا اصل مقصد چغل خوری کی مذمت کرنا ہے۔ رذائل اخلاق میں چغل خوری ایک بدترین عادت ہے جو معاشرے میں بگاڑ اور فساد برپا کرتی ہے چغل خور دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی باتیں کر کے ان میں فساد برپا کروا دیتا ہے دیہاتی چغل خور اس عادت میں بُری طرح مبتلا تھا پہلے وہ ایک گاؤں میں ذلیل وخوار ہوا اور اپنی چغل خوری ہی کی وجہ سے دوسرے گاؤں سے بھاگنا پڑا۔

چغل خور ایک لوک کہانی ہے لوک کہانیاں یا لوک داستانیں کسی معاشرے، تہذیب اور زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں ان سے جہاں محبت، ایثار اور خلوص پروان چڑھتا ہے وہاں معاشرتی رویے اور مسائل بھی اُجاگر ہوتے ہیں یہ آنے والی نسلوں کی کردار سازی کرتی ہیں۔

زیرِ تشریح نثر پارے میں لوک کہانی چغل خور کا آغاز ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں کی بات ہے کہ کسی گاؤں میں ایک چغل خور رہتا تھا۔ ایک کی بات آگے جا کر دوسرے کو لگانا اس کی عادت تھی۔ پیٹ کا ہلکا تھا۔ محض زبان کا لطف لینے کے لئے کسی ایک کی بات کسی دوسرے کو بتاتا۔ اس کی اس مکروہ حرکت کی وجہ سے متعدد بار لوگوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ لڑائی جھگڑے ہوئے۔ اس عمل میں اس کا اپنا کردار بھی نا قابل اعتبار ہو گیا۔ لوگ اسے بات بتاتے ہوئے ڈرتے۔ اسے دوبارہ ملازم نہ رکھتے۔ چنانچہ وہ معاشرے میں بدنام ہو کر رہ گیا۔ اس بدنامی سے کئی ناکامیوں

نے جنم لیا۔ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ فاقے کرنا پڑے۔ عزت و اعتبار ختم ہو گیا۔ تعلقات خراب ہو گئے۔ گاؤں چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس سب کے باوجود موصوف اپنی عادت کو نہ چھوڑ سکا۔ مشہور لوک کہاوت ہے کہ عادتیں مرنے سے ہی ختم ہوتی ہیں جو خوبی یا خامی فطرت ثانیہ بن جائے اس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔ چغل خور نے اپنی بری عادت کے نقصانات کو دیکھتے ہوئے کئی بار ارادہ کیا کہ آئندہ اب وہ کسی کی چغلی نہیں کھائے گا۔ ایک کی بات دوسرے سے نہیں کہے گا۔ لیکن عادت کی خرابی! ہر بار اپنے ارادے میں ناکام ہو جاتا۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ صحت کے بعد معاشی مسئلہ ہے۔ چغل خور نوکری سے محروم ہو کر سخت پریشان تھا اور اپنے گاؤں میں اس کی بری عادت کی وجہ سے کوئی اسے ملازمت دینے کو تیار نہیں تھا۔

شفیع عقیل نے بڑے دلچسپ انداز میں ایک اخلاقی برائی کی طرف توجہ دلائی ہے محض زبان کا چسکا پورا کرنے کے لیے لوگ ایک دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ ان کی یہ چھوٹی سی بات کتنے بڑے فتنے کو جنم دیتی ہے گھر کے گھر اُجڑ جاتے ہیں اس سبق میں بڑے دلچسپ انداز میں چغل خوری کے بُرے اثرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

انھوں نے کہانی کی صورت میں بتادیا ہے کہ ایک چھوٹی سی چغلی کتنے بڑے فساد کا پیش خیمہ بن گئی۔ نوبت خون خرابے تک جا پہنچی جب حقیقت آشکار ہوئی تو کچھ بھی نہ تھا صرف زبان کا چسکا تھا، کسی کی پیٹھ پیچھے ایسی بُرائی کرنا کہ جو اُس کی موجودگی میں کی جائے اُسے بُرا محسوس ہو چغلی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ چغلی کھانے والا ایسا ہے جیسے وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاتا ہو، چغل خوری سے ہر حال میں بچنا چاہیے۔

مشق

1-سوالات کے مختصر جوابات

(الف) کسان نے چغل خور کو کن شرائط پر ملازم رکھا؟

جواب: کسان نے چغل خور کو ان شرائط پر ملازم رکھا کہ چغل خور تنخواہ نہیں لے گا، صرف روٹی اور کپڑا لے گا اور چھ ماہ بعد وہ کسان کی چغلی کھائے گا۔

(ب) چغل خور نے کسان کی بیوی کو کیا کہہ کر بدگمان کیا؟

جواب: چغل خور نے کسان کی بیوی سے کہا کہ اس کا خاوند یعنی کسان کوڑھی ہو گیا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو چاٹ کر دیکھ لے کیوں کہ کوڑھی کا جسم نمکین ہوتا ہے۔

(ج) ہر چغل خور کس بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے؟

جواب: ہر چغل خور یہ ماننے سے انکار کرتا ہے کہ وہ چغل خور ہے۔ ہر چغل خور، چغل خور کہنے پر ناراض ہو جاتا ہے۔

(د) چغل خور کو اپنی بُری عادت سے کیا نقصان اٹھانا پڑا؟

جواب: چغل خور کو اپنی بری عادت کی وجہ سے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے اور بعد میں کوئی اسے ملازم رکھنے پر تیار نہ ہوا آخر اسے اپنا گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں جانا پڑا۔

2-لوک کہانی کی مختصر تعریف کیجیے۔

جواب: لوک کہانی کسی معاشرے، تہذیب اور زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ ان کہانیوں کے مصنف کا کسی کو اتہ پتہ نہیں ہوتا۔ یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے ذریعے سے محبت ایثار، خلوص، دوستی اور بہادری جیسی صفات معاشرے میں پروان چڑھتی ہیں۔

3- سبق "چغل خور" کے متن کو سامنے رکھ کر درست جوابات کی نشاندہی کریں۔

(الف) سبق "چغل خور" مصنف کی کس کتاب سے ماخوذ ہے؟

(الف) ✓ پنجابی لوک داستانیں (ب) چینی لوک داستانیں (ج) پنجاب کی لوک کہانیاں (د) جاپانی لوک کہانیاں

(ب) چغل خور کہاں رہتا تھا؟

(الف) ✓ گاؤں (ب) قصبے (ج) شہر (د) بیرون ملک

(ج) اپنے گاؤں کو چھوڑ کر چغل خور کہاں پہنچا؟

(الف) ✓ دوسرے گاؤں (ب) شہر (ج) بڑے قصبے (د) دبئی

(د) چغل خور کون سا کام جانتا تھا؟

(الف) لکڑی کا (ب) معماری کا (ج) لوہے کا (د) ✓ کھیتی باڑی کا

(ہ) چغل خور نے روٹی کپڑے کے علاوہ تنخواہ کی بجائے کیا رعایت مانگی؟

(الف) ✓ چھ ماہ بعد ایک چغلی کھانے کی (ب) ہر عید پر دس چھٹیاں (ج) ایک سو روپے (د) دو سو روپے نقد اور ایک چغلی

(و) چغل خور نے کیا بتایا کہ کوڑھی کا جسم کیسا ہو جاتا ہے؟

(الف) ✓ نمکین (ب) میٹھا (ج) کھٹا (د) کڑوا

(ز) چغل خور اس لیے نہیں مانتا کہ وہ چغل خور ہے کہ:

(الف) اسے ملازمت نہیں ملتی (ب) وہ اسے جھوٹ سمجھتا ہے

(ج) ✓ کسان کے بھائیوں اور سالوں سے ڈرتا ہے (د) اسے اپنی بے عزتی سمجھتا ہے

(ح) چغل خور کو چغل خور کہیں تو وہ:

(الف) لڑ پڑتا ہے (ب) بھاگ جاتا ہے (ج) ✓ ناراض ہو جاتا ہے (د) شرمسار ہو جاتا ہے

4- سبق کے متن کو مدنظر رکھ کر درست یا غلط کی نشاندہی کریں۔

(الف)- چغل خور کھیتی باڑی کا کام جانتا تھا۔ ✓ درست / غلط

(ب)- چغل خور نے کسان کی بیوی کو بتایا کہ کسان کا جسم نمکین ہو گیا ہے۔ درست / غلط ✓

(ج)- چغل خور نے کسان سے کہا کہ تمہاری بیوی پاگل ہو گئی ہے۔ ✓ درست / غلط

(د)- کسان کے سالوں نے چغل خور کی چغلی کو جھوٹ جانا۔ ✓ درست / غلط

(ہ)- جب چغل خور کی اصلیت کھل گئی تو سب اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ✓ درست / غلط

5- سبق کے متن کو مدنظر رکھیں اور قوسین میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ چن کر خالی جگہ پُر کیجئے۔

(الف) چغلی کھانا چغل خور کی ـــــــ ہوتی ہے۔ (فطرت، ✓عادت، جبِلّت)

(ب) چغل خور نے کسان کی بیوی کو بتایا کہ وہ ـــــــ ہو گیا ہے۔ (باولا، ✓کوڑھی، پاگل)

(ج) چغل خور نے کسان سے ـــــــ بعد ایک چغلی کھانے کی اجازت مانگی۔ (ایک ماہ، ✓چھے ماہ، نو ماہ)

(د) چغل خور کو چغل خور کہا جائے تو وہ ـــــــ۔ (لڑ پڑتا ہے، بھاگ جاتا ہے، ✓ناراض ہو جاتا ہے)

(ہ) چغل خور کی چغل خوری کا نتیجہ ـــــــ کی صورت میں نکلا۔ (طلاق، ✓سر پھٹول، قتل و غارت)

6- اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

7- الفاظ کے جملے بنائیں۔

الفاظ	جملے
تلملانا	کسان کے سالے چغل خور کی بات سُن کر تلملانے لگے۔
ادھ موا	کسان اپنی بیوی کو مار مار کر ادھ موا کر دیتا ہے۔
ہلکان ہونا	چور پولیس کی مار کھا کھا کر ہلکان ہو گیا۔
کانوں کان خبر نہ ہونا	پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔
شش و پنج میں مبتلا ہونا	چغل خور کی بات سن کر کسان شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔
در در کی خاک چھاننا	اسلم نے در در کی خاک چھانی لیکن نوکری نہ ملی۔

10 ۔ نام دیو مالی

مولوی عبد الحق

خلاصہ

بابائے اُردو مولوی عبد الحق اُردو زبان و ادب کے محسن، محقّق، نقاد اور عمدہ انشاپرداز تھے۔ سبق "نام دیو مالی" میں انہوں نے مالی، نام دیو کے شخصی خصائل کا خاکہ کھینچا ہے۔

نام دیو، مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ کم ذات ہونے کے باوجود ایک اچھے انسان کی تمام خوبیوں سے آراستہ تھا۔ اسے اپنے پیشے سے بے حد لگاؤ تھا۔ کام میں مصروفیت کے وقت اسے تن، من اور دھن کی کچھ خبر نہ ہوتی۔ اپنے پودوں کو اپنی اولاد خیال کرتا اور جب بھی دیکھو انہی کی تراش خراش میں مصروف نظر آتا۔ اگر کسی وجہ سے کسی پودے کو کچھ ہو جاتا تو اس کی جان پر بن جاتی۔ جب تک مسئلہ حل نہ ہو جاتا وہ چین سے نہ بیٹھتا۔ اس کا کام باغبانی تھا اور اسے باغ باغیچوں میں رہ رہ کر جڑی بوٹیوں کی خاصی پہچان ہو گئی تھی اور وہ اپنی اس مہارت کو لوگوں، بالخصوص بچوں کے علاج میں استعمال کرتا مگر اس کو اس نے اپنی آمدن کا ذریعہ کبھی نہ بنایا۔ صفائی ستھرائی کا تو وہ خوگر تھا۔ وہ نہ صرف ذاتی صفائی رکھتا بلکہ اپنے باغ کو بھی صاف وشفاف رکھتا۔ اس کی پوری خواہش اور کوشش ہوتی کہ اس کا چمن جھاڑ جھنکار سے پاک رہے۔ پودوں کے تھانولے درست اور صاف رہیں۔ اپنی اس کوشش میں وہ پورے طور پر کامیاب رہتا۔ اسی لیے اسے کبھی سخت سست کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔

جب خشک سالی کا دور دورہ تھا، باغ باغیچے پانی نہ ملنے کے باعث سوکھ چکے تھے، تب بھی نام دیو کا گلشن ہرا بھرا تھا۔ اس نے اپنا دن رات کا آرام و سکون چھوڑ کر بھی اپنے چمن کو فراہمی آب جاری رکھی۔ اس کی یہ بے مثال کارگزاری بغیر کسی انعام کے لالچ اور صلے کی تمنا کے تھی۔ یہی کام سے محبت تھی کہ جس وجہ سے اس کا گلشن ایک خوبصورت سیر گاہ میں بدل چکا تھا۔ بلاشبہ نام دیو ایک غریب آدمی تھا مگر وہ وسائل کا غریب تھا، دل کا غریب نہیں تھا۔ وہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر بھی اپنے غریب بھائی بندوں کی مدد کرتا اور ہر کسی سے خوش دلی سے ملتا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ مسکراہٹ سے سرشار رہتا۔ وہ غرور، تعصب اور رقابت جیسے جذبات سے عاری تھا۔ اُس کی تمام تر پسند و ناپسند اس کے کام تک محدود تھی۔ جب اعلیٰ حضرت نے ایک اور باغ کی ذمہ داری نواب سراج یار بہادر کے سپرد کی جو کہ باغبانی کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے سنسان مقبرہ اور بنجر باغ سرسبز و شاداب نظر آنے لگا۔ نواب صاحب نام دیو کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اسی وجہ سے نام دیو کو شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ کو خوبصورت اور روح پرور مقام بنانے کے لیے بڑی دور دور سے تعلیم یافتہ مالی بلائے گئے لیکن نام دیو ان سب سے مختلف تھا۔ وہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن کام سے لگاؤ اور سچی محبت کی وجہ سے اس کا کام سب سے اچھا ہوتا تھا۔ ایک بار وہ عالمِ محویت میں مصروف کار تھا کہ نجانے شہد کی مکھیوں کا ایک غضبناک غول کہاں سے آیا اور اس کے لئے پیغام اجل بن گیا۔ یوں دوسروں میں مسرتیں تقسیم کرنے والا اور ان کو مسائل کی دلدل سے نکالنے والا خود موت کی دلدل میں اتر گیا۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

نام دیو، مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت پنچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

سبق کا عنوان: نام دیو مالی **مصنف کا نام:** مولوی عبد الحق

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
پنچ قوم	گھٹیا، کمتر قوم	میراث	باپ دادا کی طرف سے ملنے والی اشیا۔ ملکیت
مالی	باغبان	ڈھیر	ہندوؤں کی پنچ قوم کا نام

تشریح:

مقبرہ رابعہ دورانی، اورنگ آباد میں نام دیو، مالی تھا۔ وہ ذات کے اعتبار سے ڈھیڑ تھا، جو ہندو قوم میں ایک کمتر اور گھٹیا ذات سمجھی جاتی ہے۔ قوموں کی بڑائی اور چھوٹائی کی تمیز خود ساختہ ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نسل در نسل پکی ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ

"۔۔۔ ہم نے تمام بنی نوع انسان کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے انہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹ دیا گیا ہے تا کہ یہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔۔۔"

آخری حج کے موقع پر بھی حضورؐ نے خاص طور پر تاکید کی کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی امیر کو کسی غریب پر کوئی فوقیت یا برتری حاصل نہیں لیکن بد قسمتی سے انسان رنگ و نسل، قوم اور قبیلوں کے فرق میں پڑ گئے۔ برصغیر پاک و ہند میں نسلی امتیاز ماضی بعید سے موجود ہے برہمن، ویش، کھشتری اور شودر۔ نام دیو مالی شودروں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کا کردار اتنا اعلیٰ تھا کہ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے یوں بھی سچائی، نیکی اور خوبصورتی کسی کو والدین کی طرف سے وراثت میں نہیں ملتیں یہ خداداد خوبیاں ہوتی ہیں جو اللہ اپنی مرضی سے کسی کو بھی دے سکتا ہے۔ بعض اوقات معمولی آدمیوں میں غیر معمولی صفات ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ خوبیاں کسی بھی ذات کے انسان میں پیدا ہو سکتی ہیں ان کا اونچی یا نیچی ذات سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ امیر، غریب، گورا، کالا اللہ کی نظر میں سب برابر ہیں بس محنتی انسان کا رتبہ خدا کے نزدیک بلند ہے۔

اقتباس 2:

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یُورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا اُسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر کھیل رہی ہے مکھیوں کا غضب ناک جھلّڑ اُس غریب پر ٹوٹ پڑا اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا آخر اسی میں جان دے دی۔

سبق کا عنوان: نام دیو مالی **مصنف کا نام:** مولوی عبد الحق

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	**معانی**	**الفاظ**	**معانی**
یُورش	حملہ	جھلّڑ	غول جھنڈ، لاتعداد
قضا	موت	غضب ناک	خوفناک

سیاق وسباق:

"بابائے اُردو" مولوی عبد الحق اُردو زبان وادب کے محسن، محقق، نقاد اور عمدہ انشا پرداز تھے۔ سبق نام دیو مالی میں اُنھوں نے ایک مالی، نام دیو کے شخصی خصائل کا خاکہ کھینچا ہے۔ نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد میں مالی تھا وہ بڑی لگن اور چستی سے پودوں کو اپنی اولاد کی طرح چاہتا تھا پالتا پوستا۔ اس نے چمن کو رسوئی کے چوکے کی طرح صاف رکھا اپنے لگائے ہوئے پودے کبھی خشک نہ ہونے دیئے اُسے دوسروں سے کوئی جلاپا یا حسد نہیں تھا۔ وہ تعریف کے لیے یا انعام کی خواہش میں کام نہ کرتا تھا۔ وہ پودوں کی خدمت اور پرورش کرتے کرتے شہد کی مکھیوں کا شکار ہو گیا اور مکھیوں کے کاٹنے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلا گیا۔

تشریح:

مقبرہ رابعہ دورانی، اورنگ آباد میں نام دیو، مالی تھا۔ وہ ذات کے اعتبار سے ڈھیٹر تھا، جو ہندو قوم میں ایک کمتر اور گھٹیا ذات سمجھی جاتی ہے۔ قوموں کی بڑائی اور چھوٹائی کی تمیز خود ساختہ ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نسل در نسل پکی ہو گئی ہے۔ سچائی، نیکی اور خوبصورتی کسی کو والدین کی طرف سے وراثت میں نہیں ملتی یہ خداداد خوبیاں ہوتی ہیں جو اللہ ربّ العزت کسی کو بھی دے سکتا ہے بعض اوقات معمولی آدمیوں میں غیر معمولی صفات ہوتی ہیں۔

انسان کو اپنے کام سے جتنی محبت ہو وہ اسے اتنی ہی دلچسپی سے سرانجام دیتا ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اس کی توجہ کسی کام میں جتنی زیادہ ہوتی ہے۔ باقی معاملات سے اس کی توجہ اور دلچسپی اتنی ہی کم ہو جاتی ہے۔ اپنے کام سے محبت اور محویت نے نام دیو مالی کو موت سے ہم کنار کر دیا ایک دن نام دیو مالی اس قدر محو تھا اُسے آس پاس کی کچھ بھی خبر نہ تھی یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک دن معلوم نہیں کیا معاملہ ہوا کہ اُس کے چمن میں اچانک لاکھوں کی تعداد میں شہد کی مکھیوں نے حملہ کر دیا باغ میں کام کرنے والے تمام باغبان دوڑ دوڑ کر اپنی جان بچاتے رہے کچھ ادھر اُدھر چھپ گئے۔ نام دیو مالی دنیا ومافیا سے بے خبر اپنے کام میں اس قدر مگن تھا اُسے معلوم ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اس بات سے قطع نظر کہ موت اُس کے سر پر کھیل رہی ہے اور فرشتۂ اجل اُس کے سر پر پہنچ گیا ہے۔ شہد کی خطرناک مکھیوں کا ایک ہجوم نے جو کہ ایک غول کی طرح اکٹھے ہو کر اُس کی طرف بڑھ رہا تھا، اُس غریب اور نادار ہستی پر شدت سے حملہ کر دیا۔ اُس کو شہد کی مکھیوں نے اتنا کاٹا کہ کاٹ کاٹ کر اُسے اَدھ مُوا کر دیا اور اُس میں جینے کا حوصلہ ہی نہیں رہا آخر کار وہ زخموں کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور اپنی جان دے دی۔ میرے نزدیک اُس کو شہادت نصیب ہوئی ہے اُس نے فن باغبانی کی نہ تو تعلیم حاصل کی تھی نہ اُس کے پاس کوئی ڈپلوما تھا البتہ کام کی دُھن تھی اور کام سے سچا لگاؤ تھا اسی میں اُس کی جیت تھی۔

اقتباس 3:

میں نے اس بے مثل کار گزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

سبق کا عنوان: نام دیومالی **مصنف کا نام:** مولوی عبد الحق

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
کار گزاری	خدمت گزاری	مستحق	حق دار
پالنے پوسنے	پرورش کرنا	تنگی ترشی	مشکل حالات

تشریح:

بابائے اُردو مولوی عبد الحق اُردو ادب کے محسن، محقق، نقاد اور ادیب تھے۔ سبق نام دیو مالی ان کا ایک شخصی خاکہ ہے جس میں نام دیو مالی کی شخصی خوبیوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔

زیرِ تشریح نثر پارے میں وہ مالی نام دیو کے اوصاف اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک برس بارش بہت کم ہوئی۔ خشک سالی کے باعث قحط پڑ گیا۔ پینے کو پانی نہیں میسر آتا تھا۔ شہر کے تمام باغوں کے پودے ایسے نڈھال ہو گئے جیسے دق کے بیمار لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا اٹھا کر لاتا اور پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی اپنی نیند قربان کر کے پانی تلاش کر کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔ یوں نام دیو کا چمن اس قحط اور کسمپرسی کے زمانے میں بھی سرسبز وشاداب تھا۔ مولوی عبد الحق مقبرہ رابعہ دورانی کے باغ کے نگران تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس بے مثال کام پر نام دیو مالی کو انعام دینا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پودے اس کی اولاد کی طرح ہیں اور اولاد کی پرورش والدین کی ذمہ داری ہے۔ کڑے اور بُرے حالات میں بھی بچوں کا خیال رکھنا والدین کا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے اگر پودوں کا خیال رکھا اور ان کو سوکھنے نہیں دیا تو یہ میرا فرض تھا۔ اب فرائض کی ادائیگی میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوا بالخصوص بچوں کو پالنے پوسنے میں والدین فرض ادا کرتے ہیں بچوں کی پرورش پر وہ انعام کے مستحق نہیں ہوتے تو میں کس طرح انعام کا حق دار ہوں۔

مشق

1-سوالات کے مختصر جوابات

(الف) نام دیو نے پانی کی قلّت کے زمانے میں چمن کو کیسے شاداب رکھا؟

جواب: وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کر لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انہیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قِلّت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

(ب) نام دیو مالی نے انعام لینے سے کیوں انکار کیا؟

جواب: اس کا کہنا تھا کہ بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہیں تنگی تُرشی ہو وہ تو ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

(ج) لوگ بچوں کے علاج کے لیے نام دیو کے پاس کیوں آتے تھے؟

جواب: باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔

(د) نام دیو کی موت کا سبب کیا تھا؟

جواب: مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔

(ہ) مصنف کے خیال میں اچھا انسان کیسے بنا جا سکتا ہے؟

جواب: ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے، نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے۔

(و) نام دیو مالی کے اوصاف میں سب سے نمایاں وصف کیا ہے؟

جواب: اپنے کام سے محبت اور لگاؤ۔

2- سبق کے متن کو مدِ نظر رکھ کر درست جوابات کی نشاندہی کریں۔

(الف) سبق "نام دیو" کس کتاب سے لیا گیا ہے؟

(الف) ✓ چند ہم عصر (ب) مقدماتِ عبد الحق (ج) خطباتِ عبد الحق (د) بزمِ خوش نفساں

(ب) مقبرہ رابعہ دورانی کہاں واقع ہے؟

(الف) دِلّی میں (ب) ✓ اورنگ آباد میں (ج) حیدر آباد میں (د) الہ آباد میں

(ج) باغ کے داروغہ کون تھے؟

(الف) سید سراج الحسن (ب) مولوی عبد الحق (ج) ✓ عبد الرحیم فینسی (د) ایوب عباسی

(د) نام دیو بڑی تندہی سے اپنے کام میں مصروف اور مگن رہتا تھا، اس کی وجہ تھی:

(الف) تنخواہ کا لالچ (ب) افسران کی خوشی (ج) بے عزتی کا خوف (د) ✓ اپنے کام سے محبت

(ہ) مصنف نے کس چیز کو بیگار کہا ہے؟

(الف) جبری مشقت (ب) ✓ بے مزہ کام (ج) محض حکم کی تعمیل (د) ڈر کر کام کرنے کو

(و) مصنف نے انسان کو فطری کمزوری کی بنا پر اسے کہا ہے۔

(الف) کاہل اور نکما (ب) نکما اور کام چور (ج) ✓ کاہل اور کام چور (د) دلیر مگر سست

(ز) گدلا پانی پودوں کے لئے تھا۔

(الف) ضرر رساں (ب) بے سود (ج) مفید (د) ✓ آبِ حیات

(ح) درجہ کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔

(الف) ✓ جدوجہد (ب) صلاحیت (ج) خوش بختی (د) وسائل کا ہونا

(ط) ڈاکٹر سراج الحسن کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ تھے۔

(الف) نباض (ب) فیاض (ج) ✓ مردم شناس (د) خوش مزاج

3- سبق "نام دیو مالی" کا متن مد نظر رکھ کر درست یا غلط پر نشان لگائیں۔

الف- سچائی، نیکی اور حسن کسی کی میراث نہیں۔	✓درست / غلط
ب- نام دیو پھولوں اور پھلوں کی شناخت رکھتا تھا۔	درست / غلط ✓
ج- نام دیو مالی دو بچوں کا باپ تھا۔	درست / غلط ✓
د- درجہ کمال تک پہنچنے کی کوشش سے ہر کوئی درجہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔	درست / غلط ✓
ہ- نام دیو مالی مقبرہ رابعہ دورانی کے باغ میں چوکیدار تھا۔	درست / غلط ✓
و- بے مزہ کام نہیں، بیگار ہے۔	✓درست / غلط
ز- نام دیو مالی بچوں کے علاج میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔	درست / غلط ✓
ح- باغ کے داروغہ کو دوسروں سے کام لینا نہیں آتا تھا۔	درست / غلط ✓
ط- نام دیو مالی شہد کی مکھیوں کے کاٹنے سے فوت ہو گیا۔	✓درست / غلط

4- سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

5- نام دیو مالی کی زندگی سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

جواب: نام دیو مالی کی زندگی سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنے کام سے سچا عشق ہونا چاہیے، سادگی، عاجزی اور دوسروں کی مدد کے اوصاف اپنانے چاہیں۔ انسان ذات کا بڑا ہو یا چھوٹا اگر اُس کی زندگی میں یہ اوصاف ہیں تو وہ عظیم آدمی ہے۔

6- درج ذیل الفاظ کے معنی لکھیے اور جملوں میں اس طرح استعمال کیجئے کہ تذکیر و تانیث واضح ہو جائے (ذو معنی)۔

ہار، قلم، کان، اردو، کف، لگن

جواب:

الفاظ	**جملے**
ہار	آپ کی جیت اس کی ہار ہے۔ / وہ میرے گلے کا ہار ہے۔
قلم	میرے قلم سے لکھیں۔ / یہ آم کی قلم ہے۔
کان	میرے کان میں درد ہے۔ / یہ ہیرے کی کان ہے۔
اردو	ترک فوج کا اردو لڑنے کو تیار تھا۔ / اردو زبان بڑی زبان ہے۔
کف	سمندر میں بہت کف اڑ رہا تھا۔ / یہ اس کے کفِ افسوس ملنے کا وقت تھا۔
لگن	اچھے کام کی لگن نیک بختی کی علامت ہے۔ / لگن میں کھانے کی چیز پیش کی گئی۔

7- درج ذیل محاورات اور الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجئے۔

آفت ٹوٹ پڑنا، اوسان خطا ہونا، تفویض، محظوظ، مہاکاج۔ یورش۔ بشاشت۔ بے دم ہونا۔ سیوا۔

جواب:

الفاظ	جملے
آفت ٹوٹ پڑنا	قحط میں باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔
اوسان خطا ہونا	شیر دیکھتے ہی اسد کے اوسان خطا ہو گئے۔
تفویض	اسے گھر کی حفاظت کا کام تفویض کیا گیا ہے۔
محظوظ	وہ لطیفہ سن کر محظوظ ہوا۔
مہاکاج	آپ کا ج مہاکاج۔
یورش	شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔
بشاشت	بیماری میں چہرے پر بشاشت نظر نہیں آتی۔
بے دم ہونا	مکھیوں نے نام دیو کو اتنا کاٹا کہ وہ بے دم ہو گیا۔
سیوا	نام دیو نے پودوں کی سیوا کی۔

8-درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

الفاظ	متضاد
مصنوعی	حقیقی
توانا	ناتواں
تندرست	بیمار
توقیر	تحقیر
محبت	نفرت
تریاق	زہر
رہبر	رہزن

11 ۔ علی بخش

قدرت اللہ شہاب

خلاصہ

قدرت اللہ شہاب مشہور بیوروکریٹ تھے۔ ان کی خود نوِشت "شہاب نامہ" نے عوام وخواص میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ سبق "علی بخش" اسی کتاب سے لیا گیا ہے جس میں مصنف نے علامہ اقبؔال کے ملازم علی بخش کے حوالے سے اپنی محدود رفاقت کا احوال بیان کیا ہے۔ اپنی خود نوشت کے اس اقتباس میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز میں کسی کام سے لاہور گیا ہوا تھا وہاں بیرسٹر عبدالرحیم سے ملاقات میں پتا چلا کہ اقبؔال کے ملازم علی بخش کو لائل پور میں حکومت نے ایک مربع زمین عطا کی ہے لیکن قبضہ نہیں مل رہا۔ اس سلسلے میں مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے۔ خواجہ عبدالرحیم نے مجھے جاوید منزل میں علی بخش سے ملوایا وہ جاوید اقبال کی دیکھ بھال کے باعث نہیں جانا چاہتا تھا لیکن خواجہ صاحب کے اصرار پر وہ راضی ہو گیا۔ میں اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔ میں نے علامہ اقبؔال کی بات نہ چھیڑی تو علی بخش خود ہی کہنے لگا اقبؔال کے بقول سینما کے سامنے جتنا ہجوم ہے اتنا مسجدوں کے سامنے دکھائی نہیں دیتا۔ وہ پان نہیں کھاتے تھے۔ حقہ پسند کرتے تھے۔ سیخ کباب، پلاؤ اور آم پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے آخری دن علی الصبح فروٹ سالٹ پیا اور پانچ بج کر دس منٹ پر فوت ہو گئے۔ علی بخش کو اقبؔال کے شعر یاد نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی نظم کبھی "اے حقیقتِ منتظر" گنگنایا کرتے تھے۔ رات دو ڈھائی بجے وضو کر کے نوافل ادا کرتے۔ کبھی کبھی رات کو سوتے وقت انہیں ایک جھٹکا سا لگتا۔ میں ان کے کمرے کے قریب سوتا تھا۔ میں اٹھ کر ان کی گردن کی پچھلی رگوں اور پٹھوں کو دباتا تو وہ ٹھیک ہو جاتے۔ ان کے گھر کا حساب کتاب میرے پاس تھا۔ وہ درویش آدمی تھے۔ اگر کبھی میں سفر میں بھوکا رہتا تو وہ ناراض ہوتے۔ لائل پور میں ملنے والے مربع کے سلسلے میں یہاں کے ڈپٹی کمشنر اور دوسرے افسران سے ملتا ہوں تو بڑا احترام دیتے ہیں۔ سب علامہ اقبؔال کی بدولت ہے۔ اپریل میں جاوید ولایت سے آئے گا۔ جب والدہ کا انتقال ہوا تو جاوید اور منیرا کمسن تھے۔ جرمن لیڈی ڈورس احمد ان کی اتالیق مقرر ہوئی۔ جھنگ پہنچ کر میں نے اسے ایک رات اپنے پاس رکھا اور صبح اپنے فرض شناس افسر مہابت خاں کے سپرد کیا جس نے کہا کہ اگر ہم یہ معمولی سا کام نہ کر سکیں تو ہم پر لعنت ہو۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

علی بخش کا تخیل بڑی تیز رفتاری سے ماضی کے دھندلکوں میں پرواز کر رہا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے اپنے ڈاکٹر صاحب یا جاوید یا منیرہ بی بی کی کوئی نہ کوئی خوش گوار یاد آتی رہتی ہے۔ جھنگ پہنچ کر میں اسے ایک رات اپنے ہاں رکھتا ہوں۔ دوسری نے اپنے ایک نہایت قابل اور فرض شناس مجسٹریٹ کپتان مہابت خان کے سپرد کر دیتا ہوں۔

سبق کا عنوان: علی بخش **مصنف کا نام:** قدرت اللہ شہاب

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
تخیل	گہرا خیال، تصور	خوش گوار	بھلی لگنے والی، دل پسند
دھندلکوں	شام کا وقت، علی الصبح	فرض شناس	ذمہ دار، فرض کو پہچاننے والا

تشریح:

قدرت اللہ شہاب مشہور بیورو کریٹ تھے۔ ان کی خود نوشت شہاب نامہ بہت مقبول ہوئی۔ زیر نظر نثر پارہ ای کتاب سے لیے گئے سبق کا حصہ ہے۔ مصنف علی بخش کو زمین کا قبضہ دلوانے کے لیے اسے اپنے ساتھ جھنگ لے گئے تھے جہاں کے وہ ڈپٹی کمشنر تھے۔ دوران سفر علامہ اقبال کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات علی بخش نے سنائے۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے علامہ اقبال کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کر رہا تھا اور مصنف کو سنا رہا تھا۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اسے حضرت علامہ اقبال، ان کے فرزند جاوید اقبال یا ان کی دختر نیک اختر منیرہ صلاح الدین کی کوئی نہ کوئی خوشگوار یاد آ رہی تھی۔ علامہ اقبال کی باتوں میں سفر کٹ گیا۔ جھنگ پہنچ کر مصنف نے اس کی مہمان نوازی کی۔ رات علی بخش نے مصنف کے ہاں گزاری۔ صبح مصنف نے اپنی ایک اہل مجسٹریٹ مہابت خان کی ذمہ داری لگائی کہ فیصل آباد جاؤ اور علی بخش کو اس کی زمین کا قبضہ دلواؤ۔ علی بخش کو علامہ اقبال اور اس کے خاندان کی دیرینہ خدمات کی بنا پر حکومت نے لائل پور میں ایک مربع زمین عطا کی تھی۔ اس زمین پر کچھ شر پسند عناصر قابض تھے۔ علی بخش کو اس زمین کا قبضہ نہیں مل رہا تھا۔ مصنف ڈپٹی کمشنر جھنگ تھے۔ زمین فیصل آباد (لائل پور) میں تھی۔ مصنف نے اپنے مجسٹریٹ کو ذمہ داری دی کہ دوسرے ضلع فیصل آباد جا کر اس زمین کا قبضہ حاصل کر کے دو۔ مہابت خان علی بخش کی علامہ اقبال سے نسبت کی بنا پر اس سے عقیدت سے ملا اور اعلان کیا کہ آج ہی یہ کام ہو جائے گا۔ اگر ہم اقبال کے شخص کا کام نہیں کر سکتے تو ہم پر لعنت ہے۔ جن کے تصور پر یہ ملک بنا تھا ان کے وفادار ملازم کا جائز کام نہیں ہو گا تو پھر کس کا ہو گا۔ ہم پھر یہاں ذمہ داری ادا کرنے کے قابل ہی نہیں۔

اقتباس 2:

اب علی بخش کا ذہن بڑی تیزی سے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے اور وہ بڑی سادگی سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سناتا جاتا ہے۔ ان باتوں میں قصوں اور کہانیوں کا رنگ نہیں، بلکہ ایک نشے کی سی کیفیت ہے۔ جب تک علی بخش کا یہ نشہ پورا نہیں ہوتا، غالباً اسے ذہنی اور روحانی تسکین نہیں ملتی۔ "صاحب! جب ڈاکٹر صاحب نے دم دیا ہے، میں ان کے بالکل قریب تھا۔ صبح سویرے میں نے انھیں فروٹ سالٹ پلایا اور کہا کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی لیکن عین پانچ بج کر دس منٹ پر ان کی آنکھوں میں ایک تیز تیز نیلی نیلی سی چمک آئی اور زبان سے اللہ ہی اللہ نکلا۔ میں نے جلدی سے ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انھیں جھنجوڑنے لگا لیکن وہ رخصت ہو گئے تھے۔"

سبق کا عنوان: علی بخش **مصنف کا نام:** قدرت اللہ شہاب

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
تسکین	اطمینان، سکون حاصل ہوا	دم دینا	فوت ہو جانا
کیفیت	حالت	جھنجھوڑنا	زور زور سے ہلانا / کھسوٹنا

سیاق و سباق:

اس سبق میں مصنف قدرت اللہ شہاب نے علی بخش کے حوالے سے علامہ اقبالؔ کی چند خاص باتوں کو عیاں کیا ہے۔ علی بخش کو حکومت کی طرف سے لائل پور میں ایک مربع زمین عطا ہوئی لیکن قبضہ نہ ملا۔ خواجہ عبدالرحیم نے شہاب صاحب کو کہا اور وہ علی بخش کو لے کر جھنگ روانہ ہوئے۔ راستے میں علی بخش نے بتایا کہ اقبالؔ کو سیخ کباب، پلاؤ اور آم پسند تھے۔ حقّہ پیتے تھے۔ تشریح طلب اقتباس اسی موقع سے لیا گیا ہے۔ بعد کے سبق میں علی بخش کو اقبال کے شعر یاد نہ ہونے، رات کو عبادت کرنے، گردن میں تکلیف، ان کے مالی معاملات جاوید اور منیرہ کا ذکر ہے۔ جھنگ میں شہاب اپنے ایک مجسٹریٹ کی ذمہ داری لگاتے ہیں کہ وہ علی بخش کا کام کروائے۔

تشریح:

قدرت اللہ شہاب مشہور بیوروکریٹ تھے۔ ان کی خودنوشت شہاب نامہ بے حد مقبول ہوئی سبق علی بخش اسی کتاب کا اقتباس ہے۔ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی کے محض بڑے بڑے واقعات ہی اہم نہیں ہوتے بلکہ چھوٹے چھوٹے واقعات وہ باتیں جنھیں ہم معمولی سمجھتے ہیں وہ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ باتیں وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو اس شخصیت کے قریب رہی ہوں۔ علی بخش کو علامہ محمد اقبال کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا اور ان کی زندگی کے آخری لمحات کا وہ عینی شاہد تھا۔ اس اعتبار سے اس کا بیان چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتا ہے قدرت اللہ شہاب کا موقف ہے کہ علی بخش نے جب اقبالؔ کے حقے، کھانوں کے حوالے سے گفتگو شروع کی تو وہ رواں ہو گیا اور اقبالؔ کی زندگی کے گوشے بے نقاب کرنے لگا۔ وہ اقبالؔ کے ساتھ چالیس سالہ رفاقت کے واقعات سناتا جاتا ہے۔ یہ فرضی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں اور علی بخش ایک نشے کی سی کیفیت میں اقبالؔ کی یادوں میں ڈوب کر ان کے بارے میں بتاتا جاتا ہے وہ نشے کی کیفیت میں نہ سنائے تو اسے روحانی تسکین نہیں ملتی، وہ اقبالؔ کی زندگی کے آخری لمحات کے بارے میں لب کشا ہے کہ جب ڈاکٹر اقبال نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی تو وہ ان کے قریب ہی تھا۔ 21 اپریل 1938ء کو علی الصبح اس نے اقبالؔ کو فروٹ سالٹ پلایا اور کہا کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی لیکن اقبالؔ کا آخری وقت آ چکا تھا۔ عین پانچ بج کر دس منٹ پر اقبالؔ کی آنکھوں میں ایک تیز تیز نیلی نیلی سی چمک آئی اور زبان پر ذکرِ حق جاری ہو گیا۔ انھوں نے اللہ ہی اللہ کہا۔ علی بخش نے ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انھیں ہلانے لگا کہ وہ بے ہوش نہ ہوں لیکن اقبالؔ کی روح تو اپنے مرکز کی طرف لوٹ چکی تھی اور اپنے رب سے بغرض وصال جا چکی تھی۔ عظیم فلسفی شاعر، امت مسلمہ کو خواب غفلت سے جگانے والا خود ابدی نیند سو چکا تھا۔

مشق

1- سوالات کے مختصر جوابات

(الف) علی بخش سے مصنف کی کیسے ملاقات ہوئی؟

جواب: مصنف قدرت اللہ شہاب کسی کام سے لاہور گئے تو وہاں بیرسٹر خواجہ عبدالرحیم صاحب نے بتایا کہ علامہ اقبالؔ کے ملازم علی بخش کو حکومت کی طرف سے جو مربع زمین عطا ہوئی تھی اس کا قبضہ نہیں مل رہا آپ اس کی مدد کریں۔ دونوں جاوید منزل گئے اور وہاں مصنف علی بخش سے ملے۔

(ب) علی بخش کو ایک مربع زمین کہاں اور کیوں الاٹ ہوئی؟

جواب: علی بخش نے چالیس سال علامہ اقبال کی خدمت کی پھر ان کے بچوں کا خیال رکھا۔ حکومت نے ان کی خدمات کے سلسلے میں لائل پور میں ایک مربع زمین عطا کی۔

(ج) مصنف کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے علی بخش کے دل میں کیا وہم تھا؟

جواب: جب وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ گیا تو غالباً اس کے دل میں سب سے بڑا وہم یہ تھا کہ شاید اب میں بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح علامہ اقبالؒ کی باتیں پوچھ پوچھ کر اس کا سر کھپں گا۔

(د) ایک سینما کے سامنے بھیڑ دیکھ کر علی بخش نے کیا کہا؟

جواب: ایک سینما کے سامنے بھیڑ بھاڑ دیکھ کر وہ بڑبڑانے لگا: "مسجدوں کے سامنے تو کبھی ایسا رش نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے"۔

(ہ) شیخوپورہ سے گزرتے ہوئے علی بخش کو کیا یاد آیا؟

جواب: شیخوپورہ سے گزرتے ہوئے علی بخش کو یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک بار یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں پر ایک مسلمان تحصیل دار تھے، جو ڈاکٹر صاحب کے پکے مرید تھے، انہوں نے دعوت دی تھی۔

2- سبق کا خلاصہ اپنے لفظوں میں تحریر کیجیے۔

3- علی بخش کے کردار کی نمایاں خوبیاں پیراگراف کی شکل میں لکھیں؟

جواب: علی بخش علامہ اقبال کا دیرینہ اور وفادار ملازم تھا۔ اس نے تقریباً 40 برس اقبالؔ کی خدمت میں گزارے اور بعد میں ان کے بچوں جاوید اقبال اور منیرہ کا بہت خیال رکھا۔ اُسے اقبالؔ کی باتیں یاد تھیں لیکن کلام نہیں۔ وہ اقبال کی باتیں نشے کی سی کیفیت میں سناتا۔ وہ مرتے وقت اقبالؔ کے ساتھ تھا۔ وہ ایک سادہ انسان اور اقبالؔ کا سچا وفادار خادم تھا۔

4- علامہ اقبالؒ کی وفات کا حال علی بخش کی زبانی بیان کیجیے؟

جواب: "صاحب! جب ڈاکٹر صاحب نے دَم دیا ہے، میں ان کے بالکل قریب تھا۔ صبح سویرے میں نے انہیں فروٹ سالٹ پلایا اور کہا کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی، لیکن عین پانچ بج کر دس منٹ پر ان کی آنکھوں میں ایک تیز تیز نیلی نیلی سی چمک آئی اور زبان سے اللہ ہی اللہ نکلا۔ میں نے جلدی سے ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انہیں جھنجھوڑنے لگا لیکن وہ رخصت ہو گئے تھے"۔

5- متن کی روشنی میں قوسین میں دیے گئے الفاظ کی مدد سے مندرجہ ذیل جملے مکمل کیجئے۔

جواب:

(الف) قبضہ نہیں ملتا تو کھائے ــــــــــ۔ (خصم کو، ✓ کڑھی کھیر، دھوپ)

(ب) علی بخش کے مطابق اقبالؔ اکثر ــــــ گنگناتے تھے۔ (مسلماں کے لہو میں، خودی کو کر بلند اتنا، ✓ کبھی اے حقیقتِ منتظر، تورہ نوردِ شوق ہے)

(ج) ڈاکٹر صاحب بڑے ــــــ آدمی تھے۔ (عالم، درویش، سیاسی، دانش ور)

(د) پھر علی گڑھ سے ایک ــــــ لیڈی آ گئی۔ (فرنچ، انڈین، انگلش، ✓ جرمن)

(ہ) کپتان مہابت خاں، علی بخش کو ایک نہایت مقدس ــــــ کی طرح عقیدت سے چھو کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ (✓ تابوت، کتاب، چیز، امانت)

6- سبق "علی بخش" کے متن کو مدِ نظر رکھ کر درست جوابات کی نشاندہی کریں۔

(الف) سبق "علی بخش" کس کتاب سے لیا گیا ہے؟

(الف)✓ شہاب نامہ (ب)نفسانے (ج)ماں جی (د)یا خدا

(ب) مصنف کام کے سلسلے میں کہاں گئے تھے؟

(الف)✓ لاہور (ب)لائل پور (ج)شیخوپورہ (د)جھنگ

(ج) علی بخش کو زمین کہاں دی گئی تھی؟

(الف)جھنگ (ب)✓ لائل پور (ج)لاہور (د)خانیوال

(د) آخری عمر میں علامہ محمد اقبالؒ کا کھانا پینا کم ہو گیا تھا۔

(الف)بڑھاپے کی وجہ سے (ب)دمے کی وجہ سے (ج)✓ گلے کی خرابی کی وجہ سے (د)معدے کی خرابی کی وجہ سے

(ہ) علی بخش کے مطابق ڈاکٹر اقبالؒ کی پسندیدہ خوراک کیا تھی؟

(الف)پلاؤ (ب)سیخ کباب (ج)✓ پلاؤ اور سیخ کباب (د)چپلی کباب اور زردہ

(و) حکومت نے علی بخش کو کتنی زمین الاٹ کی؟

(الف)آدھا مربع (ب)✓ ایک مربع (ج)دو مربعے (د)تین مربعے

(ز) علامہ اقبالؒ کون سا پھل پسند کرتے تھے؟

(الف)انگور (ب)لوکاٹ (ج)✓ آم (د)خوبانی

(ح) ڈاکٹر اقبالؒ رات کتنے بجے جائے نماز پر جا بیٹھتے؟

(الف)ایک بجے (ب)دو بجے (ج)اڑھائی بجے (د)✓دو اڑھائی بجے

(ط) ڈاکٹر اقبالؒ کو سوتے ہوئے جھٹکا لگتا تو کیا کرتے تھے؟

(الف)دوائی لے لیتے (ب)✓ علی بخش سے گردن کے پٹھے دبوا لیتے (ج)سو جاتے (د)بے چین ہو کر ٹہلنے لگتے

7- سبق کے متن کو مد نظر رکھ کر درست یا غلط کی نشاندہی کریں:

(الف) علی بخش سے مصنف کی ملاقات خواجہ عبد الرحیم نے کرائی۔ ✓درست / غلط

(ب) شیخوپورہ کے وکیل علامہ محمد اقبالؒ کے مرید تھے۔ درست / غلط ✓

(ج) ڈاکٹر محمد اقبالؒ گھر کے اخراجات کا حساب کتاب نہیں رکھتے تھے۔ ✓درست / غلط

(د) ڈاکٹر صاحب کے ہاں اعظم گڑھ سے جرمن لیڈی آئیں۔ درست / غلط ✓

(ہ) فروٹ سالٹ سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بحال ہو گئی۔ درست / غلط ✓

(و) مہابت خان نے اعلان کیا کہ وہ علی بخش کا کام کرا کے دم لے گا۔ ✓درست / غلط

8- سبق "علی بخش" کے متن کے مطابق کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کا رابطہ کالم (ب) کے الفاظ سے کریں۔

جوابات

کالم (الف) کالم (ب)

خواجہ عبدالرحیم	جاوید منزل
جاوید اقبال	منیرہ
پان	حُقّہ
تحصیل دار	مرید
مہابت خان	قبضہ
اڑھائی بجے	جانماز

9-حوالہ متن اور سیاق وسباق کے ساتھ درج ذیل پیراگراف کی تشریح کیجئے:

اب علی بخش کا ذہن ـــــــــــــ لیکن وہ رخصت ہو گئے تھے۔

حوالہ متن: سبق کا نام: علی بخش:

مصنف کا نام: قدرت اللہ شہاب

خط کشیدہ الفاظ کے معنی:

تسکین: اطمینان، سکون حاصل ہوا

دم دینا: فوت ہو جانا

کیفیت: حالت

جھنجھوڑنا: زور زور سے ہلانا۔

سیاق وسباق:

اس سبق میں مصنف قدرت اللہ شہاب نے علی بخش کے حوالے سے علامہ اقبالؔ کی چند خاص باتوں کو عیاں کیا ہے۔ علی بخش کو حکومت کی طرف سے لائل پور میں ایک مربع زمین عطا ہوئی لیکن قبضہ نہ ملا۔ خواجہ عبدالرحیم نے شہاب صاحب کو کہا اور وہ علی بخش کو لے کر جھنگ روانہ ہوئے۔ راستے میں علی بخش نے بتایا کہ اقبالؔ کو سیخ کباب، پلاؤ اور آم پسند تھے۔ حُقّہ پیتے تھے۔ تشریح طلب اقتباس اسی موقع سے لیا گیا ہے۔ بعد کے سبق میں علی بخش کو اقبال کے شعر یاد نہ ہوئے، رات کو عبادت کرنے، گردن میں تکلیف، ان کے مالی معاملات جاوید اور منیرہ کا ذکر ہے۔ جھنگ میں شہاب اپنے ایک مجسٹریٹ کی ذمہ داری لگاتے ہیں کہ وہ علی بخش کا کام کروائے۔

تشریح:

قدرت اللہ شہاب مشہور بیوروکریٹ تھے۔ ان کی خود نوشت شہاب نامہ بے حد مقبول ہوئی سبق علی بخش اسی کتاب کا اقتباس ہے۔ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اس کی زندگی کے محض بڑے بڑے واقعات ہی اہم نہیں ہوتے بلکہ چھوٹے چھوٹے واقعات وہ باتیں جنہیں ہم معمولی سمجھتے ہیں وہ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ باتیں وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو اس شخصیت کے قریب رہی ہوں۔ علی بخش کو علامہ محمد اقبال کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا اور ان کی زندگی کے آخری لمحات کا وہ عینی شاہد تھا۔ اس اعتبار سے اس کا بیان چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتا ہے قدرت اللہ شہاب کا موقف ہے کہ علی بخش نے جب اقبالؔ کے حقے، کھانوں کے حوالے سے گفتگو شروع کی تو وہ رواں ہو گیا اور اقبالؔ کی زندگی کے گوشے بے نقاب کرنے لگا۔ وہ اقبال کے ساتھ چالیس سالہ رفاقت کے واقعات سناتا جاتا ہے۔ یہ فرضی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں اور علی بخش ایک نشے کی سی کیفیت میں اقبال کی یادوں میں ڈوب کر ان کے بارے میں بتاتا جاتا ہے وہ نشے کی کیفیت میں نہ سنائے تو اسے روحانی تسکین نہیں ملتی، وہ اقبالؔ کی زندگی

کے آخری لمحات کے بارے میں لب کشا ہے کہ جب ڈاکٹر اقبال نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی تو وہ ان کے قریب ہی تھا۔ 21 اپریل 1938ء کو علی الصبح اس نے اقبال کو فروٹ سالٹ پلایا اور کہا کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی لیکن اقبال کا آخری وقت آ چکا تھا۔ عین پانچ بج کر دس منٹ پر اقبال کی آنکھوں میں ایک تیز تیز نیلی نیلی سی چمک آئی زبان پر ذکرِ حق جاری ہو گیا۔ انہوں نے اللہ ہی اللہ کہا۔ علی بخش نے ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انہیں ہلانے لگا کہ وہ بے ہوش نہ ہوں لیکن اقبال کی روح تو اپنے مرکز کی طرف لوٹ چکی تھی اور اپنے رب سے بغرض وصال جا چکی تھی۔ عظیم فلسفی شاعر، امت مسلمہ کو خواب غفلت سے جگانے والا خود ابدی نیند سو چکا تھا۔

10- درجِ ذیل الفاظ کے مترادف لکھیے۔

جوابات:

الفاظ	مترادف
شریر	شرارتی
آمادہ	تیار
بھیڑ	ہجوم
سادگی	بھولا پن
فارغ	بری، آزاد
مقدس	پاک
خوش گوار	خوش آئند

12 ۔ استنبول

حکیم محمد سعید

خلاصہ

حکیم محمد سعید مشہور طبیب، ادیب اور سیاسی و سماجی شخصیت تھے۔ سبق "استنبول" میں اُنھوں نے ترکی کے مشہور شہر استنبول کی سیر کا احوال پیش کیا ہے۔

استنبول شہر مسلمانوں نے 672ء میں پہلا حملہ کیا لیکن یہ حملہ ناکام ہو گیا۔ پھر سلطان محمد فاتح ثانی نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کرتے ہوئے 29 مئی 1453ء میں استنبول پر مکمل قبضہ کر لیا۔ سلطان جب شہر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس نے ایا صوفیا میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ مسلمانوں نے استنبول میں بہت سی تعمیرات کا اضافہ کیا۔ دیواروں اور چھتوں کی پچی کاری پر سرمی قلعی کروادی گئی۔ جلدی دیواروں پر بُت بنے تھے انہیں گرا کر نئی دیواریں بنا دی گئیں۔ سلطان محمد نے ایک بلند مینار تعمیر کروایا جبکہ سلیم ثانی نے دوسرا اور مراد ثالث نے باقی دو مینار اور مرمت کا سارا کام مکمل کروایا۔ صدر دروازے کے پاس اندر کی جانب سنگ جراحت کی دو بڑی بڑی نالیاں اور دو بڑے چبوترے تعمیر کروائے جن پر بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کی جاتی ہے۔

استنبول کو مساجد کا شہر کہا جاتا ہے۔ پورے شہر میں تقریباً پانچ سو مساجد ہیں۔ لیکن اسلامی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ سلیمانیہ مسجد ہے، سلیمانیہ سے ملحق ایک بڑا کتب خانہ ہے جہاں مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اندازے کے مطابق ایک لاکھ قلمی کتابیں نہایت ترتیب و تنظیم سے رکھی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد توپ کاپی ہے جو ترکی میں ایک نہایت اہم عجائب گھر ہے۔ آثار قدیمہ کے علاوہ یہاں فوجی عجائب خانہ بھی ہے۔ اس عجائب گھر میں بعض ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جن کا ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے۔ فن خطاطی کے مظہر کی حیثیت سے قرآن کریم کی وہ آیات جو مشہور خطاطوں کی ہنر مندی کے نمونے کی حیثیت سے عالمی شہرت رکھتی ہیں، توپ کاپی میں موجود ہیں۔ رسولؐ اللہ کی سیرت و سوانح پر خط نسخ میں ایک اہم مخطوطہ یہاں موجود ہے۔ یہاں سے ہم نماز ظہر ادا کرنے کے لیے مسجد سلطان احمد آ گئے۔ یہ مسجد چھ میناروں کی وجہ سے مشہور ہے اور بہت سے مذہبی تہواروں کے منانے اور درباری رسم کے جلوسوں کا مرکز رہ چکی ہے۔ میں استنبول میں آکر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ کے مزار پر ضرور آتا ہوں آج بھی ہم مزار اقدس پر حاضر ہوئے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ حضورؐ کے میزبان رہے جن کی شخصیت کا خاصہ جوش ایمانی، حق گوئی اور آنحضرت ﷺ سے بے پناہ محبت ہے۔ استنبول پر چڑھائی کرنے والے لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاری شامل تھے۔ سفر جہاد میں وبا پھیلی اور مجاہدین کی بڑی تعداد وبا کا شکار ہوئی۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ بھی علیل ہوئے۔ ان کا انتقال ہوا تو انہیں استنبول کی دیواروں کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ آج یہی مقبرہ دنیا کے مسلمانوں کے لیے مرجع خیر و برکت بنا ہوا ہے۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

اس مسجد کی تعمیر سلطان سلیمان کے ایما پر فنِ تعمیر کے مشہور ماہر معمار جناب محترم سنان کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کا سنگ بنیاد ۱۵۵۰ء میں رکھا گیا اور ۱۵۵۷ء میں اس کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ مسجد ترکی کی تمام مساجد سے ممتاز ہے۔ اس مسجد کا گنبد بہت ہی دل نواز ہے، اس گنبد کے میں چھوٹے چھوٹے پانچ اور گنبد ہیں، جو بالکل اس طرح محسوس ہوتے ہیں، جیسے تاروں کے درمیان چاند۔ اس مسجد کی کھڑکیوں پر بے انتہا نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ یہ مسجد ترکوں کے فنِ تعمیر اور ان کی نفاست پسندی کا حسین مرقّع ہے۔
سلیمانیہ سے ملحق ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ یہاں مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اندازے کے مطابق ایک لاکھ قلمی کتابیں یہاں ہیں اور نہایت ترتیب و تنظیم سے رکھی ہوئی ہیں۔

سبق کا عنوان: استنبول **مصنف کا نام:** حکیم محمد سعید

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
مرقع	تصویروں کی کتاب مجموعہ	ممتاز	فضیلت والا، اعلیٰ
ایما	اشارہ خواہش	پایہ تکمیل کو پہنچنا	مکمل ہونا

تشریح:

مسجد سلیمانیہ محض عبادت گاہ نہیں بلکہ وہ ماہرین تعمیر اور بادشاہ کی خداوند تعالی سے محبت کا اظہار بھی ہے کہ صدیوں گزر جانے کے باوجود اس عمارت کا حسن ماند نہیں پڑا حکیم محمد سعید سلیمانیہ مسجد کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں کہ اس مسجد کی تعمیر سلطان سلیمان کی خواہش پر مشہور ماہر تعمیرات جناب محترم سنان کے ہاتھوں ہوئی۔ اس مسجد کی بنیاد 1550ء میں رکھی گئی اور 1557ء کو تعمیر کا کام مکمل ہوا۔ اس مسجد کو ترکی کی تمام مساجد میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس مسجد کا گنبد بہت ہی خوب صورت ہے جو دلوں کو موہ لیتا ہے اس خوبصورت گنبد کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پانچ اور گنبد ہیں جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ تاروں کے جھرمٹ میں چاند جگمگا رہا ہو۔ اس مسجد کی کھڑکیوں پر خوبصورت نقاشی کی گئی ہے یہ مسجد ترکوں کے طرزِ تعمیر اور ان کی صفائی پسندی کا حسین نمونہ ہے۔ سلیمانیہ مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑی لائبریری بھی ہے جہاں غیر مطبوعہ قلمی نسخوں کا سب سے بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ قلمی کتابیں اس لائبریری میں موجود ہیں جو انتہائی ترتیب اور سلیقے سے رکھی گئی ہیں۔ مساجد کے ساتھ مکتب اور کتب خانے کی روایت بھی پرانی ہے۔ اس کی بہترین مثال جامع الازہر اور مسجد سلیمانیہ اور اس کا کتب خانہ ہے۔ چونکہ اسلام نے علم کے حصول کو دینی فریضہ قرار دیا۔

ارشاد نبویؐ ہے:

"۔۔۔علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔۔۔"

مسلمان حکمران کوشش کرتے رہے کہ وہ دوسرے سماجی و فلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ علم کے فروغ کے لیے بھی کوشش کرتے رہیں۔ مصنف سلیمانیہ سے ملحق کتب خانے کی تعریف میں رطب اللّسان ہیں کہ اس میں نہ صرف دنیا کی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں بلکہ وہ بڑے

سلیقے اور قرینے سے رکھی گئی ہیں۔ کسی بھی کتب خانے میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کتاب صرف موجود ہی نہ ہو اس تک رسائی بھی ممکن ہو۔

اقتباس2:

اسلامی علوم وفنون اور ثقافت کو آگے بڑھانے میں سلاجقہ ترک، بالخصوص عثمانی حکمرانوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ انھی کے علمی ذوق کی وجہ سے استنبول کا عجائب خانہ توپ کاپی، جہاں نوادر اور آثارِ قدیمہ کا مشہورِ عالم مرکز بنا، وہاں علم و فن کے بیش بہا ذخیروں اور نادر کتابوں کا بھی مخزن بنا۔ نوادرِ کتب اور اہم مخطوطات کے الگ شعبے ہیں۔ بعض ایسی کتابیں بھی وہاں موجود ہیں کہ جن کا ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے اور وہ نسخہ توپ کاپی میں ہے۔

سبق کا عنوان: استنبول **مصنف کا نام:** حکیم محمد سعید

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
ثقافت	تہذیب، رسم ورواج، رہن سہن	نادر	نایاب عمدہ
مخزن	خزانہ	آثار قدیمہ	پرانے نشانات

سیاق وسباق:

"سعید سیاح ترکی میں" حکیم محمد سعید کا سفر نامہ ہے۔ سبق "استنبول" اُن کے اسی سفر نامہ سے ماخوذ ہے۔ حکیم محمد سعید طب اسلامی کانفرنس کے سلسلے میں حکومت ترکی کی دعوت پر استنبول تشریف لے گئے تھے۔

ترکی کے وزیر اعظم ترگت اوزال اس کانفرنس کے میزبان تھے۔ اس سفر نامے میں حکیم محمد سعید نے مسجد ایا صوفیہ، سلیمانیہ مسجد اور توپ کاپی کے عجائب گھر کے بارے میں مختصر معلومات دی ہیں۔ آخر میں رسولؐ اللہ کے جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا عقیدتاً ذکر کیا ہے جن کا استنبول کے محاصرے کے دوران انتقال ہو گیا اور وہ استنبول ہی میں مدفون ہیں۔

تشریح:

مسلمان بادشاہوں نے عام طور پر علم وادب کی سرپرستی کی ہے حکیم محمد سعید کے بقول سلاجقہ ترک خاص طور پر عہد عثمانی کے حکمرانوں نے علوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے علمی شوق کی وجہ سے استنبول کا عجائب خانہ توپ کاپی شہرہ آفاق بنا۔ کتب خانوں کی اہمیت محض کتابوں کی تعداد کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کتب خانے میں کتنی نایاب کتابیں موجود ہیں۔ اس اعتبار سے استنبول کا یہ کتب خانہ انتہائی اہم ہے۔ توپ کاپی میں نایاب اور آثار قدیمہ کی کئی چیزیں محفوظ ہیں جن کا ایک ہی نسخہ پوری دنیا میں موجود ہے اور وہ واحد نسخہ یہیں پر ہے۔ مساجد کے ساتھ مکتب اور کتب خانے کی روایت بھی پرانی ہے۔ اس کی بہترین مثال جامع الازہر اور مسجد سلیمانیہ اور اس کا کتب خانہ ہے۔ چونکہ اسلام نے علم کے حصول کو دینی فریضہ قرار دیا۔ ارشاد نبویؐ ہے:

"۔۔۔علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔۔۔"

مسلمان حکمران کوشش کرتے رہے کہ وہ دوسرے سماجی وفلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ علم کے فروغ کے لیے بھی کوشش کرتے رہیں۔ مصنف سلیمانیہ سے ملحق کتب خانے کی تعریف میں رطب اللسان ہیں کہ اس میں نہ صرف دنیا کی نادر ونایاب کتابیں موجود ہیں بلکہ وہ

بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھی گئی ہیں۔ کسی بھی کتب خانے میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کتاب صرف موجود ہی نہ ہو اس تک رسائی بھی ممکن ہو۔

مشق

1-سوالات کے مختصر جوابات

(الف) استنبول پر مسلمانوں کے پہلے حملے کی خاص بات کیا تھی؟

جواب: استنبول کے شہر پر مسلمانوں کا پہلا حملہ ۶۷۲ء میں ہوا تھا، لیکن وہ سات سال تک محاصرے کے بعد ناکام واپس ہوئے۔ اس محاصرے کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس میں جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ) شریک تھے۔ اسی مہم کے دوران میں ان کا انتقال ہوا اور وہ استنبول ہی میں مدفون ہوئے۔

(ب) ایا صوفیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

جواب: ایا صوفیہ قسطنطنیہ کا تاریخی کلیسا تھا جو اب مسجد ہے۔ سلطان محمد فاتح نے سب سے پہلے اس میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ مسلمانوں نے اس میں بہت سی تعمیرات کا اضافہ کیا۔ دیواروں اور چھتوں کی پچی کاری پر سرمئی کلئی کروادی گئی۔ جن دیواروں پر بت بنے ہوئے تھے انہیں گرا کر نئی دیواریں بنوادی گئیں۔ عثمانی بادشاہوں نے مینار بنوائے، کلام پاک کی تلاوت کے لئے چبوترے بنوائے، خالی دیواروں پر آیات لکھوائیں، ملحقہ جگہ پر مدرسہ بنوایا، دارالطعام بنوایا اور ایک کتب خانہ قائم کیا۔

(ج) ترکی میں جمعۃ المبارک کا آدھا آدھا خطبہ کن دو زبانوں میں دیا گیا؟

جواب: خطبہ جمعہ آدھا عربی اور آدھا ترکی زبان میں تھا۔

(د) "توپ کاپی" میوزیم کا تعارف اپنے الفاظ میں کرائیے۔

جواب: استنبول کے عجائب خانوں میں توپ کاپی کی حیثیت شہرہ آفاق ہے۔ یہاں رومی، بزنطینی اور عثمانی عہد کی ہزاروں لاکھوں قیمتی اشیاء رکھی گئی ہیں، اس میں عثمانی سلاطین کے آثار، جواہرات، ملبوسات اور دیگر اشیائے آرائش و تزئین کے علاوہ چینی، جاپانی، عربی اور یورپی عجائبات بھی رکھے گئے ہیں اور اس میں نادر کتب کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔

(ہ) مصنف کے شریکِ سفر دوستوں کے نام تحریر کیجیے۔

جواب: محترمہ خانم ڈسلوا، ڈاکٹر محمد شعیب اختر، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، ڈاکٹر ظفر اقبال۔

2-حوالہ متن اور سیاق وسباق کے ساتھ درج ذیل پیراگراف کی تشریح کیجئے۔

"توپ کاپی میں آثارِ قدیمہ کے ــــــ جن کا ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے"۔

جواب:

حوالہ متن:۔ یہ پیراگراف حکیم محمد سعید کے تحریر کردہ سبق استنبول سے لیا گیا ہے۔

مشکل الفاظ کے معنی:

آرٹ: فن   ذوق: دلچسپی، شوق

تشریح:

مصنف حکیم محمد سعید ترکی میں استنبول کی سیر کو گئے وہاں دیگر مقامات کے علاوہ انہیں مشہور عجائب گھر توپ کاپی میں فوجی عجائب خانہ دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ وہ بتاتے ہیں کہ توپ کاپی میں فوجی عجائب خانے کو اوقاف کہتے ہیں۔ اس میں ترکی فنون، ادب، کشیدہ کاری اور فن مصوری کے حیرت انگیز نمونے موجود ہیں۔ اسلامی علوم وفنون اور ثقافتی روایات کو آگے بڑھانے میں عثمانی ترکوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ ان کے علمی شوق کی وجہ سے استنبول کا عجائب خانہ توپ کاپی آثار قدیمہ کا مشہور ترین مرکز بن گیا وہاں علم و فن کے بیش بہا خزانے موجود ہیں۔ دنیا کے مختلف علوم کے بارے میں قیمتی اور منفرد کتابیں اس کے کتب خانے کا زیور ہیں۔ نایاب کتابوں اور غیر مطبوعہ مخطوطات کے الگ الگ شعبے وہاں موجود ہیں۔ بعض ایسے مخطوطات بھی موجود ہیں جن کا ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے۔

چونکہ اسلام نے علم کے حصول کو دینی فریضہ قرار دیا۔ ارشاد نبوی ہے:

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"

مسلمان حکمران کوشش کرتے رہے کہ وہ دوسرے سماجی و فلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ علم کے فروغ کے لئے بھی کوشش کرتے رہیں۔ مصنف سلیمانیہ سے ملحق کتب خانے کی تعریف میں رطب اللسان ہیں کہ اس میں نہ صرف دنیا کی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں بلکہ وہ بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھی گئی ہیں۔ کسی بھی کتب خانے میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کتاب صرف موجود ہی نہ ہو اس تک رسائی بھی ممکن ہو۔

3- سبق استنبول کا متن مدنظر رکھ کر درست جوابات کی نشاندہی کریں۔

(الف) سبق "استنبول" کس کی تحریر ہے؟

(الف) اختر ریاض الدین (ب) ✓ حکیم محمد سعید (ج) قدرت اللہ شہاب (د) شفیع عقیل

(ب) مسجد سلیمانیہ کس نے تعمیر کرائی؟

(الف) سلطان مراد (ب) ✓ سلطان سلیمان (ج) سلیم ثانی (د) سلطان عبد الحمید

(ج) ایا صوفیہ کے برابر کیا ہے؟

(الف) عجائب گھر (ب) کتاب خانہ (ج) ✓ قبرستان (د) فوجی عجائب خانہ (اوقاف)

(د) مسلمانوں نے استنبول پر پہلا حملہ کب کیا؟

(الف) ✓ ۶۷۲ء (ب) ۶۷۱ء (ج) ۶۷۳ء (د) ۶۷۷ء

(ہ) مسلمانوں نے استنبول کا محاصرہ کتنے سال بعد اٹھایا؟

(الف) پانچ (ب) ✓ سات (ج) آٹھ (د) نو

(و) استنبول کا فاتح کون ہے؟

(الف) حضرت ایوب انصاری (ب) ✓ سلطان محمد فاتح (ج) مراد ثانی (د) محمد ثانی

(ز) استنبول کو کس کا گھر کہا جاتا ہے؟

(الف) عجائب گھروں (ب) ✓ مسجدوں (ج) کتب خانوں (د) مقبروں

(ح) مسجد سلیمانیہ کے ساتھ کتب خانے میں کتنے قلمی نسخے ہیں؟

(الف)۳۰ ہزار (ب)۵۰ ہزار (ج)✓ایک لاکھ (د)ڈیڑھ لاکھ

4- سبق "استنبول" کے متن کے مطابق کالم (الف) کے الفاظ کا ربط کالم (ب) کے الفاظ سے کریں:

جوابات:

کالم (الف)	کالم (ب)
دوسرا مینار	سلیم ثانی
توپ کاپی	ولیم راجرز
فاتح استنبول	سلطان محمد فاتح
آٹھ لوحیں	مصطفیٰ عزت آفندی
چھ مینار	جامع مسجد سلطان احمد
تین نمایاں چیزیں	حضرت ایوب انصاری

5- متن کی روشنی میں قوسین میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ منتخب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے۔

(الف) خان محمد فاتح گھوڑے سے اتر کر ـــــــ میں داخل ہوا۔ (مسجد، غار، محل، ✓کلیسا)

(ب) پورے شہر میں ـــــــ مساجد ہیں۔ (چار سو، ✓پانچ سو، چھ سو، ایک ہزار)

(ج) ترکی کے وزیر اعظم جناب ترگت اوزال ہمارے ـــــــ تھے۔ (ہمراہ، ✓میزبان، مہمان، مہربان)

(د) سلیمانیہ سے ملحق ایک بڑا ـــــــ ہے۔ (✓کتب خانہ، مدرسہ، کالج، عجائب گھر)

(ہ) جامع سلطان احمد اپنے ـــــــ میناروں کی وجہ سے مشہور ہے۔ (چار، ✓چھ، آٹھ، دس)

6- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

الفاظ	جملے
محاصرہ	فوجوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔
جلیل القدر	حضرت عمر (رضی اللہ) جلیل القدر صحابی تھے۔
مدفون	حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ) استنبول میں مدفون ہیں۔
سرمئی	شام کے سرمئی اندھیروں میں یادوں کے چراغ جلتے ہیں۔
منہدم	تاریخی عمارتیں منہدم ہوتی جا رہی ہیں۔
تنظیم	تنظیم کے بغیر قومی بہتری ناممکن ہے۔
مخطوطہ	عجائب گھر میں کئی مخطوطات موجود ہیں۔
مسودہ	کتاب کا مسودہ چھپنے کے لیے تیار ہے۔
کاشانہ	آپ کے کاشانہ دولت میں کتنے کمرے ہیں۔

قضاوقدر	قضاوقدر انسانی قدرت سے باہر ہیں۔
مرجع	روضہ رسول ﷺ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے مرجعِ خیر و برکت بنا ہوا ہے۔

13 ۔ خطوطِ غالؔب

مرزا اسد اللہ خان غالؔب

خلاصہ

مرزا اسد اللہ خان غالؔب، اُردو کے شہرہ آفاق شاعر اور نثر نگار تھے۔ اُن کے مکاتیب اُردو نثر کا سرمایہ ہیں۔ ان کی جدت پسندی نے اردو نثر کو نیا انداز و آہنگ عطا کیا۔ انہوں نے خطوں کے رسمی انداز کو ترک کر کے خط کو بے تکلفانہ گفتگو اور شخصی و دلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

☆ مرزا غالؔب منشی ہر گوپال کے کول سے خط آنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن وہ سکندر آباد آ گئے وہاں سے غالؔب کو خط لکھا۔ شیو نرائن کے مطبع آگرہ میں غالؔب کی کتابوں کی چھپائی جاری ہے اور خواہش ہے کہ کام اچھا ہو جائے۔ منشی بالمکند کے خط کا جواب نہیں دے سکے منشی ہر گوپال کے ذمہ لگایا کہ اُن کو سلام کہیں اور کتابوں کی بابت دریافت بھی کریں۔

☆ منشی ہر گوپال کے نام دوسرے خط میں ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاید کوئی نیا قانون آ گیا ہے کہ سکندر آباد کے لوگ دلی والوں کو خط نہ لکھیں گے۔ منشی شیو نرائن کے مطبع میں غالؔب کی کتابیں چھپ رہی تھیں وہ مکمل ہو کر آ گئی ہیں۔ چھاپا، سیاہی، کاغذ، خط وغیرہ سب اچھا تھا اور غالؔب کو یہ کتابیں پسند آئیں۔ وہ منشی ہر گوپال سے آگرہ آمد کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

☆ میر مہدی کے نام خط میں غالؔب بتاتے ہیں کہ حالات اچھے نہیں کاغذ اور ٹکٹ کی کمی ہے، کتاب سے کاغذ پھاڑ کر میر مہدی کو خط لکھتے ہیں اور کسی طرف سے آمدن کی امید ہے وہ آ جائے تو ٹکٹ، کاغذ اور لفافے منگوا لوں۔ برخوردار میر نصیر الدین کو بیٹی کی مبارک دیتے ہوئے عظیم النسا بیگم نام تجویز کیا ہے۔ میر مہدی کو ہدایت کرتے ہیں کہ میر نصیر الدین کو مجتہد العصر لکھا کرے۔ دلی کی بابت بیان کرتے ہیں کہ ہر چیز پر ٹیکس لگا ہے سوائے اناج اور اُپلوں کے۔ جامع مسجد کے گرد میدان کھودا جا رہا ہے۔ دکانیں اور حویلیاں مسمار کی جا رہی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر حاکمِ اکبر کی آمد کی خبر ہے کہ وہ دلی آئیں گے یا نہیں، آتے ہیں تو بلاوا آتا ہے یا نہیں۔ پنشن بند ہو گئی تھی، معلوم نہیں کہ کب اس کا دوبارہ اجرا ہو۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

شہر کا حال کیا جانوں کیا ہے؟ "پون ٹوٹی کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دار البقا فنا ہو جائے گی۔"

سبق کا عنوان: خطوطِ غالب **مصنف کا نام:** مرزا اسد اللہ خان غالب

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی
پون ٹوٹی	(ٹاؤن ڈیوٹی)، محصول چنگی
محصول	ٹیکس، لگان، اجرت، کرایہ
جامع مسجد	مرکزی مسجد جہاں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہو۔ شاہی مسجد دہلی مراد ہے۔
دارالبقا	مفتی صدرالدین کی درس گاہ، لغوی معانی باقی رہنے والا گھر۔

تشریح:

مرزا اسد اللہ خاں غالب اُردو ادب کے شہرۂ آفاق شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کے مکاتیب اردو میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر نثر پارہ ان کے میر مہدی کے نام مکتوب کا حصہ ہے جس میں جنگ آزادی کے بعد دِلّی کے ماحول کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ 1857ء کی جنگ کے بعد دِلّی پر افتاد آن پڑی، شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ لوگ بھاگ نکلے۔ انگریزوں نے جی بھر کی شہر کو لوٹا۔ بغاوت کا مرکز دِلّی تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے جی بھر کے شہر کو لوٹا۔ بغاوت کا مرکز دِلّی تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے فتح کے بعد شہریوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیں۔ پہلے صرف پانچ ہزار لوگوں کو واپسی کا پروانہ ملا۔ غالب دورانِ جنگ دِلّی میں ہی مقیم رہے تھے۔ ان کے دوست اسی پس منظر میں ان سے حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ اس اقتباس میں انہی حالات کا ذکر ہے غالب کہتے ہیں کہ مجھے جو کچھ معلوم ہے اس کے مطابق شہر میں داخلے کے لیے محصول چونگی عائد کر دی گئی ہے۔ تمام اشیا پر ٹیکس لگ چکا ہے سوائے اناج اور اُپلے کے۔ گندم، چاول، جوار، باجرہ اور سوکھے گوبر پر کوئی ٹیکس نہیں لگا۔ اس کے علاوہ ہر شے لانے پر ٹیکس لگ چکا ہے۔ جامع مسجد دہلی کے ارد گرد پچیس فٹ چوڑائی تک تمام عمارتیں گرا دی جائیں گی۔ دکانیں حویلیاں جو اس کی زد میں آئیں گی گرا کر گول میدان بنایا جائے گا اس کی زد میں مفتی صدر الدین کی مشہور درس گاہ بھی آئے گی۔ دارالبقا دینی درس گاہ کے طور پر مشہور تھی۔ نام تو اس کا رکھا گیا تھا کہ یہ بقا کا گھر ہے لیکن یہ بھی فانی نکلی۔ سچ ہے ہر چیز کو زوال ہے اور ہر شے فانی ہے سوائے اللہ کی ذات اور نام ہمیشہ رہے گا۔

اقتباس 2:

اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمہارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔ ناگاہ کل جو خط آیا معلوم ہوا کہ دو دن کول میں رہ کر سکندر آباد آ گئے ہو اور وہاں سے تم نے خط لکھا ہے۔ دیکھیے: اب یہاں کب تک رہو اور آگرہ کب جاؤ۔ پرسوں برخوردار شیو نرائن کا خط آیا تھا۔ لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے۔ اب قریب ہے کہ بھیجی جائیں۔ مرزا مہر بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے! کس دن کتابیں آ جائیں۔ خدا کرے سب کام دل خواہ بنا ہو۔

سبق کا عنوان: خطوطِ غالب **مصنف کا نام:** مرزا اسد اللہ خان غالب

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
دل خواہ	پسندیدہ۔ مرضی کے مطابق	برخوردار	بیٹا
کول	علی گڑھ	خط	مکتوب

سیاق و سباق:

یہ پیراگراف خطوط غالب میں موجود اُس خط سے لیا گیا ہے جو مرزا غالب نے اپنے عزیز دوست اور شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ کے نام لکھا ہے۔ غالب انہیں محبت سے مرزا تفتہ بھی کہتے ہیں اور غالب کے سب سے زیادہ خطوط انہی کے نام ہیں۔ اس خط میں غالب مرزا تفتہ سے کہتے ہیں کہ کول سے تمھارے خط کا انتظار کر رہے تھے لیکن تمھارا خط سکندر آباد سے آیا۔ میری کتابیں جلد آ جائیں گی۔ اور منشی بے صبر کے خط کا کیا جواب دوں تم سے ملیں تو میرا اسلام کہنا اور مطبع سے کتابوں کی بابت خود ہی دریافت کر لینا۔

تشریح:

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے 1857 کے بعد شاعری کی نسبت نثر نگاری زیادہ کی ہے اور نثر میں بھی خطوط زیادہ لکھے ہیں۔ ان کے خطوط نہ صرف ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ اس عہد کی تاریخ کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ انسان فطری طور پر اثبات ذات چاہتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس زندگی میں دوسروں کے لیے اہمیت رکھے اور اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اسے یاد رکھیں۔ چنانچہ بعد از مرگ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ انسان ایسے کام کر جائے جو اس کے بعد اس کی یاد دلاتے رہیں۔ ایک شاعر اور ادیب کے لیے یہ کام اس کی تحریر ہو سکتی ہیں۔ غالب اپنی اخیر عمر میں اپنی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں بڑے حساس ہو گئے تھے ان کے خطوط اور دوسری نثری کتابوں کے علاوہ ان کے شعری دیوان کی اشاعت اور ان کی فراہمی میں مرزا ہر گوپال تفتہ نے اہم کردار ادا کیا تھا مرزا غالب اپنے شاگرد اور دوست تفتہ کو کتابوں کی اشاعت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کتابوں کی جلد بندی ہو رہی ہے شاید اس کام میں ایک ہفتہ لگ جائے اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ یہ سارا کام ایسا ہو کہ جی خوش ہو جائے۔

اقتباس 3:

نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے، اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ اور ٹکٹ منگالوں گا سہ شنبہ ۸ نومبر صبح کا وقت ہے۔ جس کو عوام بڑی فجر کہتے ہیں۔ پرسوں تمھارا خط آیا تھا، آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں، اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

سبق کا عنوان: خطوطِ غالب **مصنف کا نام:** مرزا اسد اللہ خان غالب

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
فتوح	بالائی آمدن۔ نذر نیاز	بیرنگ	بغیر ٹکٹ کے خط
غمگین	دکھی	خط	مکتوب

تشریح:

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے 1857 کے بعد شاعری کی نسبت نثر نگاری زیادہ کی ہے اور نثر میں بھی خطوط زیادہ لکھے ہیں۔ ان کے خطوط نہ صرف ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ اس عہد کی تاریخ کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ تشریح طلب پیراگراف میں غالب کہتے ہیں کہ میرے پاس نہ ہی ٹکٹ ہے اور نہ ہی کاغذ اور نہ ہی ان دونوں کے خریدنے کو پیسے۔ کتاب سے کاغذ پھاڑ کر تمہیں خط لکھتا ہوں اور پرانے پڑے لفافے میں بیرنگ ہی بجھوا رہا ہوں آج شام کہیں سے روپیہ آنے کی امید ہے پھر کاغذ، ٹکٹ اور لفافے خرید لوں گا۔ ان جملوں سے غالب کی مالی حالت کا اندازہ ہوتا ہے اصل میں 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد وہ تمام افراد جن کا تعلق بہادر شاہ ظفر

کے دربار سے تھا اُن پر غداری کا مقدمہ قائم کیا گیا غالب پر بھی یہ مقدمہ قائم ہوا لیکن غالب اس مقدمہ سے بری ہو گئے لیکن اُن کی پینشن کا مسئلہ جو پہلے ہی الجھا ہوا تھا مزید الجھ گیا اور وہ مزید مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ غالب کے یہاں عام طور پر دوستوں کی محفلیں سجی رہتی تھیں جو انگریز حکومت آنے کے بعد اجڑ گئیں غالب اُن محفلوں کی تلافی دوستوں کو خطوط لکھ کر کیا کرتے تھے کہ خط بھی آدھی ملاقات ہوتی ہے۔
تشریح طلب اقتباس سے ہمیں غالب کی شخصیت میں موجود برداشت اور تحمل کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے شہزادوں جیسی زندگی گزاری ہو اُس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ دوستوں کو لکھے گئے خط پر ٹکٹ لگا سکے اور انھیں بیرنگ خط بھیجنے پر مجبور ہو جائے۔

مشق

1-سوالات کے مختصر جوابات

(الف) مرزا غالبؔ نے میر مہدی حسین مجروح کو خط، بیرنگ کیوں بھیجا؟

جواب: مرزا غالبؔ نے بیرنگ خط اس لیے بھیجا کہ ان کے پاس نہ ٹکٹ تھا نہ ٹکٹ کے پیسے اور نہ ہی کاغذ تھا۔

(ب) مرزا غالبؔ نے میر مہدی مجروح کو خط کب لکھا؟

جواب: مرزا غالبؔ نے میر مہدی مجروح کو خط سہ شنبہ ۸ نومبر 1859ء کو لکھا۔

(ج) کون سی دو چیزوں پر محصول وصول نہیں کیا جاتا تھا؟

جواب: اناج اور اُپلے پر محصول وصول نہیں کیا جاتا تھا۔

(د) مرزا غالبؔ نے کتابوں پر کیا رائے دی ہے؟

جواب: مرزا غالب نے کتابوں پر اچھی رائے دی کہ ان کا چھاپا، خط کاغذ اور تقطیع و سیاہی دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔

(ہ) تفتہ نے غالبؔ کو خط کہاں سے لکھا تھا؟

جواب: منشی ہر گوپال تفتہ نے غالبؔ کو خط سکندر آباد سے لکھا تھا۔

2-درست جوابات کی نشاندہی کریں:

(الف) میر مجروح کے خط میں کس کی بیٹی کی پیدائش کا ذکر ہے؟

(الف) میر مجروح (ب) ✓ میر نصیر الدین (ج) میرن (د) شاہ محمد عظیم

(ب) "پون ٹوٹی" (چنگی) کس چیز پر معاف تھی؟

(الف) ترکاری اور پھل (ب) ✓ اناج اور اپلے (ج) غلہ اور ترکاری (د) پھل اور بادام

(ج) مرزا غالبؔ کو تفتہ کا خط کہاں سے آتا تھا؟

(الف) کلکتہ (ب) سکندر آباد (ج) ✓ کول (د) دہلی

(د) کس شخص نے کتابوں کی شیرازہ بندی کے بارے میں مرزا کو خط لکھا؟

(الف) تفتہ (ب) میرن (ج) میر مہدی مجروح (د) ✓ شیونرائن

(ہ) دوسرے خط کے مطابق مرزا غالبؔ کو کتنی کتابیں موصول ہوئیں؟

(الف) بیس (ب) ✓ تینتیس (ج) تیس (د) تینتالیس

(و) مرزا غالب نے تفتہ کو دوسرا خط کب لکھا؟

(الف) تین نومبر ۱۸۵۸ (ب) ۱۳ نومبر ۱۸۵۷ (ج) ✓ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ (د) ۲۳ نومبر ۱۸۵۸

3- خطوط غالبؔ کے متن کو ذہن میں رکھ کر درست یا غلط کی نشاندہی کریں۔

الف۔ مرزا غالبؔ نے میر نصیر الدین کو بیٹی کی پیدائش پر مبارک باد دی۔	✓درست / غلط
ب۔ تیسرے خط میں دارالبقا کے فنا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔	✓درست۔ غلط
ج۔ مرزا غالبؔ نے تفتہ کو پہلا خط لکھا تو تفتہ کول میں تھے۔	درست / غلط ✓
د۔ مرزا غالب کو کتابیں ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو ملیں۔	✓درست / غلط
ہ۔ دوسرے خط میں دلی کے خاک نشینوں سے مراد خود مرزا غالبؔ کی ذات ہے۔	✓درست / غلط

4- ان جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) دارالبقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا۔

جواب: دارالبقا مفتی صدر الدین کی درسگاہ تھی جو جامع مسجد کے ساتھ تھی۔ مسجد بڑی کرنے کا پروگرام شروع ہوا تو دارالبقا کو بھی گرا دیا گیا۔ غالب نے اپنے خط میں اس طرف اشارہ دیا ہے۔ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ دارالبقا گر جائے، مسجد باقی رہے گی، جیسے اللہ کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

(ب) حاکم اکبر کی آمد سن رہے ہیں۔

جواب: 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب بہادر شاہ ظفرؔ کو رنگون میں قید کر دیا گیا تو اکثر یہ افواہیں گردش کرتی تھیں کہ بادشاہ آئے گا۔ جنگِ آزادی کے دو سال بعد بھی یہی مشہور ہوا۔ غالبؔ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ آتے ہیں تو بلاوا آتا ہے یا نہیں، کچھ پتہ نہیں۔

(ج) منشی بالمکند بے صبر کے ایک خط کا جواب ہم پر فرض ہے۔

جواب: منشی بالمکند بے صبر سکندر آباد کے رہنے والے تھے انہوں نے غالب کو خط میں اپنے سفر کا حال لکھا تھا۔ غالب کہتے ہیں کہ اب اس کا جواب فرض ہے لیکن اس خط کے مندرجات کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے کہ منشی صاحب تو سفر میں ہیں۔ اس لئے میری طرف سے منشی ہر گوپال تفتہ صاحب آپ ان کو سلام کہہ دینا۔

(د) کیا یہ آئین جاری ہوا ہے؟

جواب: غالب منشی ہر گوپال کو کہتے ہیں کہ آپ نے خط نہیں لکھا کیا انگریزوں نے کوئی نیا حکم جاری کیا ہے کہ سکندر آباد والے دلی والوں کو خط نہ لکھیں۔

(ہ) خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔

جواب: 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے دلی پر قبضہ کر لیا اور وہاں تبدیلیاں کیں چنانچہ غالبؔ بتا رہے ہیں کہ شہر میں عمارتیں گرانے کا عمل جاری ہے اور خان چند کا محلّہ شاہ بولا کے برگد کے درخت تک گرا دیا جائے گا۔

5- کالم (الف) کے الفاظ کالم (ب) سے ملائیں۔

جواب

کالم(الف)	کالم(ب)
پہلا خط	ہر گوپال تفتہ
شیو نرائن	کتابوں کی شیرازہ بندی
دوسرا خط	ہر گوپال تفتہ
دارالبقا	فنا
غالب کے خطوط	خلیق انجم
بیٹی کا قدم مبارک	میر نصیر الدین

6-مندرجہ ذیل پر اعراب لگائیے:

مَجْرُوْحْ

تَفْتَہْ

مُجْتَہِدُالعَصْرْ

بَرْخَوْرْدَاْرْ

تَحْوِیْلْ

14 ۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی

خلاصہ

رشید احمد صدیقی صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ بنیادی طور پر وہ مزاح نگار اور مضمون نگار تھے۔ ان کے خطوط انشا پردازی کے عمدہ نمونہ ہیں۔

☆پہلے خط میں جو ڈاکٹر محمد حسن کے نام ہے اس میں ساہتیہ اکادمی سے ملنے والے اعزاز کا بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ خوش ہوں لیکن اس کے بارے میں ابھی گھر والوں کو نہیں بتایا۔ تصدیق ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس میں آپ کا تعاون بھی رہا۔ آپ کے احسانات مجھ ناچیز پر بہت زیادہ ہیں۔ آپ کی شرافت قابلیت دیرینہ وضع داری میرے ساتھ کسی بزرگ دوست اور عزیز سے کم نہیں۔

☆دوسرا خط جو رشید احمد صدیقی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے 10 جولائی 1973ء کو ظہیر احمد صدیقی کے نام لکھا اس میں وہ ان کے والد محترم کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی وفات سے ہم سب کو بہت بڑا صدمہ ہوا ہے اور ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کسی طرح بھی پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ مرحوم کے زیر سایہ آپ نے پرورش پائی۔ یہ آپ کے لئے بڑی سعادت ہے۔ اردو فارسی اور عربی ادبیات پر مرحوم کی گہری نظر تھی وہ علمی مسائل پر بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال فرماتے۔ اللہ تعالی مرحوم کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔

☆ذاکر باغ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر سید بشیر الدین کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ جواب میں دیر ہو گئی میں اپنے ذمہ کچھ قرض نہیں رکھنا چاہتا۔ کچھ دنوں سے ہجوم میں بھی تنہائی کا احساس ہونے لگا ہے۔ آپ نے علی گڑھ اور الہ آباد کے موجود شب وروز کے بارے میں لکھا ہے۔ میں ان کی صداقت کا اقرار کرتا ہوں کیوں کہ میں خود ایسے حالات سے گزر رہا ہوں۔ مسلمانوں کا موجودہ صدی کے ابتدائی 30، 40 سالوں میں یہی حال رہا۔ مشترک خصوصیات اور رجحانات تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور آگے بالعموم مسجد مکتبوں میں مکمل ہوتی تھی یا گھریلو لائبریری سے فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ اخلاقی اور تفریحی کتابیں ہمارے تخیل کو گرمی اور جولانی بخشتیں اور یہی تخیل ہم کو یا ہم اس کو لیے علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ نے ہمیں اخلاقیات سے متعارف کروایا۔ اس پر ہمیں فخر ہے۔ آپ کی ہندوستان گیر شہرت سے آپ کی انہیں کتابوں کے حوالے سے ہے، اس کا آپ نے حق ادا کر دیا۔ آپ کی علی گڑھ سے بڑی نسبت رہی اس کے لیے آپ مدتوں یاد رکھے جائیں گے۔ علی گڑھ کی وہی قدر و قیمت ہے جو ہندوستان کے باہر اس علم وفن کی ہے۔ بہت سے لوگ اچھی چیز کا احترام کرنے کی استعداد سے محروم ہو چکے ہیں لیکن ان کو بھی شہرت اقتدار اور دولت اسی طفیل نصیب ہوئی یہاں سے دور رہ کر وہ اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

نثر پاروں کی تشریح

اقتباس 1:

آپ کی شرافت، قابلیت اور دیرینہ وضع داری کا مجھے جو احساس ہے، میرا خیال ہے کہ آپ کے لیے کسی دوست، عزیز اور بزرگ سے کم نہیں ہے۔ ان نظامِ خطبات کو شہرت دینے اور کامیاب بنانے میں آپ کا گراں قدر حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش، نیک نام اور اقبال مند رکھے، آمین۔ بیگم صاحبہ اور بچوں کو بہت بہت دعا۔

سبق کا عنوان: خطوط رشید احمد صدیقی **مصنف کا نام:** رشید احمد صدیقی

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
دیرینہ	پُرانی	گراں قدر	قیمتی
وضع داری	رکھ رکھاؤ	اقبال مند	بلند درجے والا خوش بخت

تشریح:

رشید احمد صدیقی نے مختلف اوقات میں اپنے دوستوں کو خطوط لکھے۔ زیرِ تشریح پیرا گراف اُن کے ایک خط سے ہے جو ڈاکٹر محمد حسن کے نام ہے۔ رشید احمد صدیقی ڈاکٹر محمد حسن کی محبت کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب سے میرا آپ سے تعلق قائم ہوا ہے آپ کی خدمات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میرے دل میں بھی آپ کی بہت عزت ہے لیکن میری چھوٹی موٹی باتوں سے آپ کے احسانات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، میں آپ کی قابلیت کا معترف ہوں۔ آپ کی شرافت بے مثال ہے۔ آپ کی مستقل مزاجی اور طور طریقے پر ڈٹے رہنے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ میرے دل میں جو آپ کی عزت اور مقام ہے آپ کے لیے کسی دوست، عزیز اور بزرگ سے کم نہیں۔ میری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔ کسی بھی دانش گاہ میں تعلیم و تدریس، تالیف و تصنیف او تحقیق کا کام مسلسل جاری رہتا ہے۔ برِ صغیر پاک و ہند کی دانش گاہوں میں علی گڑھ یونی ورسٹی نے توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ خطبات مختلف علوم کے ماہرین دانش گاہ کے طلبا اور اساتذہ کے سامنے دیتے تھے۔ بعد میں ان خطبات کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جاتا تھا۔۔ رشید احمد صدیقی اس ضمن میں ڈاکٹر محمد حسن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان نظامِ خطبات کو شہرت دینے اور کامیاب بنانے میں آپ کا حصہ بہت نمایاں اور قیمتی ہے۔ میری کامیابی میں آپ برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ خدا آپ کی عزت اور مرتبے کو ہمیشہ بڑھائے آپ کا ساتھ شاملِ حال رہا تو خدا کے کرم سے مجھے ہمیشہ کامیابی ملے گی۔ خدا آپ کا مقام بلند کرے۔ آمین۔ بیگم صاحبہ اور بچوں کو بہت بہت دعا۔

اقتباس2:

میرا خیال ہے کہ مرحوم سے شاید ہی کبھی کسی کی کو تکلیف پہنچی ہو۔ شریف شخص کی یہ صفت سب سے معتبر مانی گئی ہے۔ اُردو، فارسی اور عربی ادبیات پر مرحوم کی نظر بڑی گہری، وسیع اور مُتنوّع تھی جس کے ہم سب ہمیشہ معترف رہے اور اس سے استفادہ کیا۔ ناملائم الفاظ کبھی زبان پر نہیں لائے۔ بڑے شوق اور سنجیدگی سے علمی مسائل پر اظہارِ خیال فرماتے۔

سبق کا عنوان: خطوط رشید احمد صدیقی **مصنف کا نام:** رشید احمد صدیقی

خط کشیدہ الفاظ کے معانی:

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
متنوع	کئی طرح کی، قسم قسم کی	استفادہ	فائدہ اُٹھانا

معترف	تسلیم کرنا / مان لینا / اعتراف کرنا	معتبر	قابل اعتبار / بھروسے والا

سیاق وسباق:

رشید احمد صدیقی ایک صاحب طرز انشاپرداز ہیں۔ اُن کے خطوط اُن کے اچھا انشاپرداز ہونے کی واضح مثال ہیں۔ زیر نظر پیراگراف بھی اُن کے ایک تعزیتی خط جو انھوں نے ظہیر احمد صدیقی کے والد کی وفات پر لکھا، سے لیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ مولانا ضیا احمد صاحب مرحوم سب کے دوست اور مہربان تھے۔ اُن کی وفات کا صدمہ ناقابل برداشت ہے۔ مرحوم کے سایہ شفقت کی بدولت آپ دوسروں کی نظر میں معتبر ٹھہرے۔ آپ کے لیے آپ کے والد صاحب کی تربیت بہت بڑی نعمت تھی۔

تشریح:

یہ ہمارا مشاہدہ بھی ہے۔ مذہب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ یہ دنیا عارضی اور ناپائیدار ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "ہر شے فانی ہے۔" "ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔"

جب کوئی عزیز دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو ہر وہ شخص جس کا کسی بھی حوالے سے اس کا تعلق ہوتا ہے وہ دکھ محسوس کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تعزیت کرنا ہمارے مذہبی اور تہذیبی شعائر میں شامل ہے۔ رشید احمد صدیقی اپنے دوست ظہیر احمد صدیقی کو ان کے والد کے انتقال پر تعزیت پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ضیا احمد صاحب مرحوم بہت مشفق اور ہمدرد انسان تھے۔ مرحوم کی وفات کا جو دکھ ہے اُس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان کے زیر سایہ آپ کو زندگی میں بہت سے فائدے حاصل ہوئے۔ اُن کی وجہ سے آپ کا مقام اور رتبہ بڑھا اور آپ کے لیے یہ بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ مرحوم سے شاید ہی کبھی کسی شخص کو تکلیف پہنچی ہو، کسی بھی شریف شخص کی یہ خوبی سب سے افضل سمجھی جاتی ہے۔ اردو، عربی اور فارسی ادبیات پر مرحوم کی نظر بڑی گہری، وسیع اور کئی قسم کی تھی جس کی ہم سب نے ہمیشہ تعریف کی اور اس سے فائدہ حاصل کیا۔ آپ ناخوشگوار الفاظ زبان پر نہیں لائے آپ ہمیشہ دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے بڑے شوق اور سنجیدگی سے علمی مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ اُن کی وفات سے مشرقی ادب اور آداب میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ مستقبل قریب میں شاید ہی پُر ہو سکے۔ کسی بھی شخص کی یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اُس کے مرنے کے بعد اُسے اچھے لفظوں میں یاد کیا جائے یہ سعادت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ضیا احمد مرحوم ایسے ہی خوش قسمت لوگوں میں شامل تھے اور اس کا سبب اُن کا کردار تھا جس میں کوئی کمی یا جھول ہمیں نظر نہیں آتا۔

مشق

1- سوالات کے مختصر جوابات

(الف) رشید احمد صدیقی کے پہلے خط کے مخاطب کا نام کیا ہے؟

جواب: ڈاکٹر محمد حسن۔

(ب) "خطوط کا جواب عموماً ہم روزہ دیتا ہوں" اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس سے مراد ہے خط کا جواب اسی دن دینا۔

(ج) مکتوب نگار نے خاندانوں کی مشترک خصوصیات وروایات کا سرچشمہ کس چیز کو قرار دیا ہے؟

جواب: مشترک خصوصیات کا سرچشمہ مذہب، اخلاق، تاریخ اور تہذیب تھی۔

(د) ظہیر الدین صدیقی کے نام مکتوب میں کس شخصیت کی وفات پر اظہار تعزیت کیا گیا ہے؟

جواب: مولانا ضیا احمد مرحوم صاحب۔

(ہ) ڈاکٹر محمد حسن کا شکریہ کس بات پر ادا کیا گیا ہے؟

جواب: اُن کی خدمات اور محبت کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

2- متن کی روشنی میں قوسین میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے۔

الف۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے خوابوں کی تعبیر ـــــــ میں پائی۔ (کلکتہ، ✓ علی گڑھ، دہلی)

ب۔ سید بشیر الدین لائبریری کے مہتمم کے علاوہ ـــــــ بھی تھے۔ (متعلم، معلم، ✓ علم کے متلاشی)

ج۔ رشید احمد صدیقی بشیر احمد صاحب کو مزید لکھنا چاہتے تھے، مگر ـــــــ۔ (انہیں نیند آگئی، ✓ وہ تھک گئے، ایک اور کام میں مصروف ہو گئے)

د۔ صدیقی صاحب نے ـــــــ کے والد صاحب کی وفات پر انہیں تعزیتی خط لکھا۔ (✓ ظہیر احمد صدیقی، محمد حسن، بشیر الدین)

ہ۔ رشید احمد صدیقی کو ۲۴ فروری ۱۹۷۳ء کو ایک ـــــــ ملی۔ (✓ خوش خبری، رجسٹری، بد خبری)

3- سبق "خطوط رشید احمد صدیقی" کا متن مد نظر رکھ کر درست جواب کی نشاندہی کریں:

(الف) رشید احمد صدیقی نے خطوط کس شہر سے بھجوائے؟

(الف) دِلّی　(ب) ✓ علی گڑھ　(ج) لاہور　(د) لکھنؤ

(ب) رشید احمد صدیقی نے اپنے خط میں کس کے گراں بار احسانات کا شکریہ ادا کیا؟

(الف) مولانا ضیا احمد　(ب) ✓ ڈاکٹر محمد حسن　(ج) ظہیر احمد صدیقی　(د) سید بشیر الدین

(ج) رشید احمد صدیقی نے خط میں کس کے سانحہ رحلت کا ذکر کیا ہے؟

(الف) ✓ مولانا ضیا احمد　(ب) بیگم ڈاکٹر محمد حسن　(ج) برادر سید بشیر الدین　(د) بیگم سید بشیر الدین

(د) مکتوب نگار نے اپنے خط بنام ڈاکٹر محمد حسن میں کس خوش خبری کا ذکر کیا ہے؟

(الف) غالب ایوارڈ ملنے کی　(ب) تصنیف پر نقد رقم ملنے کی　(ج) محکمانہ ترقی کی　(د) ✓ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ملنے والے اعزاز کی

(ہ) خط بنام پروفیسر بشیر الدین میں کن لوگوں کی احترام کرنے کی صلاحیت سے محرومی کا ذکر کیا ہے؟

(الف) علم و عمل سے خالی　(ب) احترام کے مفہوم سے نابلد　(ج) ✓ علی گڑھ کی ناقدری کرنے والے　(د) مادیت پسند

(و) "بہت کچھ اور لکھنا چاہتا تھا لیکن تھک گیا" صدیقی صاحب نے یہ جملہ کس کے نام لکھا؟

(الف) ظہیر احمد صدیقی　(ب) ✓ سید بشیر الدین　(ج) ڈاکٹر محمد حسن　(د) مولانا ضیا احمد

4- درج ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

جوابات:

الفاظ	**جملے**
استعداد	طلباء اساتذہ کی رہنمائی میں اپنی تعلیمی استعداد بڑھاتے ہیں۔

کرشمہ	پاکستان قدرت کا کرشمہ ہے۔
اسلاف	ہمیں اسلاف کی روایات پر عمل کرنا چاہیے۔
متنوع	رشید احمد صدیقی کے خطوط میں وسیع اور متنوع موضوعات ہے۔
اشغال	بچے مختلف اشغال میں مصروف تھے۔
مہتمم	کسی بھی ادارہ میں نظم وضبط کی پابندی مہتمم اعلیٰ کی ذمہ داری ہے۔
طفیل	والدین کی دعاؤں کے طفیل کامیابی ملتی ہے۔
سعادت	خدا نے میرے والدین کو حج کی سعادت نصیب فرمائی۔
معظمات	میں اپنے والدین کے سایہ شفقت میں زندگی کے معظمات سے بہرہ مند ہوا۔

5-کالم (الف) کے اندراجات کو کالم (ب) سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
تعزیت نامہ	علی گڑھ یونیورسٹی
ہجوم میں	مشترک مکتبوں
رشید احمد صدیقی	بنام ظہیر احمد صدیقی
ابتدائی تعلیم وتربیت	دوسرا خط
۳نومبر ۱۹۷۳ء	احساس تنہائی

6-درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

الفاظ	متضاد
اسلاف	بچے
نیک نام	بدنام
سخاوت	کنجوسی
اعتراف	انکار
آباد	ویران
نشیب	فراز

15 ۔ میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت

(میر انیسؔ)

بند نمبر 1

گرمی کا روزِ جنگ کی، کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لو کہ الحزر، وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

تشریح:

میر ببر علی انیسؔ بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھے۔ نظم "میدان کربلا میں گرمی کی شدت" ان کے ایک طویل مرثیے کا حصہ ہے، جس میں تخیل اور لفظی تصویر کاری سے میدان کربلا میں گرمی کی شدت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

میر انیسؔ میدان کربلا میں گرمی کی انتہا کو بیان کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ کے روز بے حد و حساب گرمی تھی۔ اتنی گرمی تھی کہ اس گرمی کا ذکر کرتے وقت یہ ڈر ہے کہ زبان ہی نہ جلنے لگ جائے۔ کرب و بلا ریگستانی خطہ ہے۔ یہاں موسم گرما شدید اور طویل ہوتا ہے۔ محرم میں حضرت امام حسین رضی اللہ کوفہ کی طرف اپنی بیعت کے لیے عازم سفر تھے۔ انہیں یزیدی لشکر نے میدان کربلا میں پڑاؤ ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں شدید گرمی تھی اتنی لو تھی کہ انس و چرند پرند پناہ مانگتے تھے، اتنی تپش تھی کہ ہر ذی روح امان طلب کرتا تھا۔ میدان جنگ کی زمین شدید ترین گرمی کے باعث یوں سرخ ہو چکی تھی جیسے لوہا بھٹی میں لال ہو جاتا ہے۔ آسمان بھی شدتِ تپش کے باعث نیلے سے پیلے رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جب گرمی زوروں پر ہو تو دھول مٹی اڑتی ہے اور گرد و غبار کے بادل مطلع آسمان کو گرد آلود کر دیتے ہیں جس سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ نیز نمی نہ ہونے کے باعث آسمان کا رنگ زرد زرد سا محسوس ہوتا ہے۔ اس دن بھی یوں ہی ہوا تھا۔ زمین پر ایک اور قیامت خیز منظر تھا، ٹھنڈا پانی نایاب تھا۔ چشمہ و دریا کا پانی ابل رہا تھا۔ باد سموم چل رہی تھی۔ گرم لو کے تکلیف دہ جھونکے ہر شے کو خشک کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہوا سے آگ برس رہی ہو۔ عام طور پر پانی بخارات بن کر اُڑے تو ہوا میں خنکی پیدا ہوتی ہے لیکن وہاں بالکل متضاد منظر تھا۔ اتنی شدید گرمی تھی ہوا میں شدید ترین تپش تھی۔ گرم ہوا گویا کسی آگ کے الاؤ سے آ رہی تھی جس نے پورے صحرا کو تنور کی طرح گرم کر دیا تھا۔ ایسے می راہ حق کے مجاہد نام خدا بلند کرنے کے لیے ثابت قدمی سے باطل کے خلاف ڈٹے ہوئے تھے۔

بند نمبر2:

وہ لو، وہ آفتاب کی حِدت، وہ تاب وتب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سُوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے، تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک، خوش تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فُرات کا

تشریح:

میر ببر علی انیسؔ بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھے۔ نظم "میدان کربلا میں گرمی کی شدت" ان کے ایک طویل مرثیے کا حصہ ہے، جس میں تخیل اور لفظی تصویر کاری سے میدان کربلا میں گرمی کی شدت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

شاعر میدان کربلا میں گرمی کی شدت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہوا شدید گرم تھی۔ باد سموم سے ہر چیز جھلس رہی تھی۔ سورج کی حدت اپنی پوری شدت کے ساتھ ہر زمینی شے کو متاثر کر رہی تھی۔ اتنی تپش تھی کہ انسان چرند پرند اور پودے سبھی بے حال تھے۔ گرمی کی حدت کے سبب گرد و غبار کے بادل پورے آسمان کو اپنے محیط میں لیے ہوئے تھے۔ فضا کی ہر چیز جلی ہوئی تھی۔ دھوپ سے فضا جل کر کالی ہو گئی تھی اور دن میں رات کا سماں تھا۔ میدان کربلا میں موجود نہر علقمہ کے لب گرمی کی حدت و شدت سے سوکھے ہوئے تھے۔ نہر علقمہ میں پانی نایاب ہو چکا تھا۔ فرات کے پانی میں بلبلوں کی بری حالت تھی، وہ سب تپ رہے تھے۔ عام طور پر موسم گرما میں دریا کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور ارد گرد علاقہ بھی گرمی کی حدت سے محفوظ ہوتا ہے لیکن میدان کربلا میں نہر علقمہ کے ارد گرد آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ شدید گرمی اور حدت سے زمین سوکھ چکی تھی اور اوپری تہہ دھول مٹی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ریت اور مٹی ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھی۔ زندگی کا چشمہ خشک ہو چکا تھا۔ ہر ذی روح کے لیے جینا محال ہو چکا تھا۔ دھوپ کی تپش سے دریائے فرات کا پانی یوں کھول رہا تھا گویا اسے آگ کے الاؤ پر رکھ دیا گیا ہو۔ شاعر نے اگرچہ مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے تاہم مطمع نظر یہ ہے کہ میدان کربلا میں جہاں امام حسینؓ اور دوسرے راہ حق کے مجاہد خیمہ زن تھے وہاں گرمی زوروں پر تھی۔ گرمی کے باعث ابتلا و آزمائش راہِ حق کے قافلے کو درپیش تھی۔

بند نمبر3:

جھیلوں سے چار پائے نہ اٹھتے تھے تابہ شام
مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام
پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثلِ موم خام
سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے، سبزی گیاہ سے

پانی کنوؤں میں اُترا تھا سائے کی چاہ سے

تشریح:

میر ببر علی انیس بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھے۔ نظم "میدان کربلا میں گرمی کی شدت" ان کے ایک طویل مرثیے کا حصہ ہے، جس میں تخیل اور لفظی تصویر کاری سے میدان کربلا میں گرمی کی شدت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

میر انیس میدان کربلا میں گرمی کی شدت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سورج آگ برسا رہا تھا شدید لو اور حدت تھی۔ تمام ذی روح سہمے ہوئے اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ جن کو جھیلوں کی قربت میسر تھی وہ تمام چوپائے جھیلوں میں پانی میں بیٹھ کر گرمی کا مقابلہ کر رہے تھے اور پانی سے ٹھنڈک حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوپائے سارا سارا دن جھیلوں میں بیٹھے رہتے اور شام سے پہلے باہر نہ نکلتے۔ سمندر مچھلیوں کا ٹھکانہ تھا اور وہ زیر آب آگ برساتے سورج اور جلانے والی لو سے بچنے کے لئے چھپی ہوئی تھیں۔ گرمی کی شدت سے ہرنوں کی طاقت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت دوڑنے بھاگنے میں مشہور ہرن گرمی سے نڈھال ہو کر سست اور کاہل ہو چکے تھے، دوڑنے بھاگنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ گرمی کی حدت اور شدت سے چیتوں کا رنگ کالا پڑ چکا تھا۔ جانوروں میں پھرتیلے اور چست نظر آنے والے جانور چیتے، بے حال اور نڈھال تھے اور رنگ تبدیل ہو چکی تھی۔ پتھر بھی گرمی کا مقابلہ نہیں کر پائے تھے۔ اتنی گرمی تھی کہ پتھر کچی موم کی طرح پگھل چکے تھے۔ پتھر سخت سے سخت درجہ حرارت کو سہہ جاتے ہیں لیکن میدان کربلا میں شاعر کے بقول اتنی گرمی تھی کہ پتھر بھی گرمی کی شدت برداشت نہ کر سکے اور غیر پختہ موم کی مانند پگھل کر رہ گئے۔ اتنی زوروں کی گرمی تھی کہ پھول اپنا رنگ و روپ کھو بیٹھے تھے۔ تمام گلوں سے سرخی غائب تھی۔ ہری بھری گھاس کا رنگ اُڑ چکا تھا، گھاس پیلی پڑ چکی تھی۔ کنوؤں میں پانی، گرمی سے گھبرا کر سائے کی تلاش میں، گہرائی میں اتر چکا تھا۔ یعنی شدید گرمی سے پانی بھی پناہ مانگ رہا تھا۔

بند نمبر 4:

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے، نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرہ مدقُوق زرد تھے

تشریح:

میر ببر علی انیس بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھے۔ نظم "میدان کربلا میں گرمی کی شدت" ان کے ایک طویل مرثیے کا حصہ ہے، جس میں تخیل اور لفظی تصویر کاری سے میدان کربلا میں گرمی کی شدت کی منظر کشی کی گئی ہے۔

میر انیس میدان کربلا جہاں حسینی اور یزیدی لشکر کا مقابلہ تھا، میں گرمی کی شدت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دسویں محرم کو بے حساب گرمی تھی۔ ہر چیز جھلس چکی تھی۔ میلوں تک گرمی کا راج تھا۔ درختوں پر سے پھل پھول غائب تھے۔ سب گرمی کا شکار ہو چکے تھے، کھجور کا ہر درخت بے ثمر چنار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سارے نخلستان ٹنڈ منڈ ہو چکے تھے۔ نہ تو کہیں کلیاں تبسم کرتی تھیں نہ سبزہ زار مہکتے تھے۔ گرمی نے سبزہ زاروں اور گلوں کے چہروں کو کُملا دیا تھا یا سکھا دیا تھا۔ پھلدار درختوں کی ہر شاخ سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔

شدید گرمی نے ہر ذی روح پر اثرات مرتب کیے تھے۔ ہر کوئی پریشان تھا اور زندگی ختم ہونے کے خوف سے دوچار تھا۔ سب کے دل گرمی کے اثرات سے موت آنے کے ڈر سے سرد پڑ چکے تھے۔ حرکتِ قلب گرمی کی مرہونِ منت ہے لیکن اس بلا کی گرمی سے وہاں ہر زندہ شے کے دل، جان کے خوف کے باعث ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ پتے تپ دق کے مریض کے چہرے کی طرح پیلے پڑ چکے تھے۔

بند نمبر 5

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہُو نہ مُنہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غُبار سے
گردُوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بُخار سے
گرمی سے مُضطرِب تھا زمانہ زمین پر
بُھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

تشریح:

میر ببر علی انیسؔ بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھے۔ نظم "میدان کربلا میں گرمی کی شدت" ان کے ایک طویل مرثیے کا حصہ ہے، جس میں تخیل اور لفظی تصویر کاری سے میدان کربلا میں گرمی کی شدت کی منظر کشی کی گئی ہے۔

میر انیسؔ میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیز دھوپ کی تمازت نے ہر زندہ شے کو بے حال کر دیا تھا اور شیر جیسا بہادر جانور دھوپ کے ڈر سے اپنی کچھار سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ ہرنوں کی جان لبوں پر آئی ہوئی تھی، وہ سبزہ زاروں میں سائے میں بیٹھے گرمی سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیز دھوپ کے باعث سطح زمین دھول مٹی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور فضا ساری دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ گرد و غبار کے بادلوں نے سورج کے چہرے کو مکدر کر دیا تھا۔ زمین اتنی گرم تھی کہ اس کی حدت سے آسمان کو بخار ہو چکا تھا۔ زمین پر انسان چرند پرند سب بے چین اور بے حال تھے۔ گرمی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ زمین اتنی گرم ہو چکی تھی کہ بھٹی پر رکھے ہوئے برتن کی طرح تپ چکی تھی۔ چنانچہ اناج کا جو بھی دانہ زمین پر گرتا بھن جاتا۔ میر انیسؔ نے راہ حق کے مجاہدوں یعنی حسینی قافلے کے ارکان کی قوت برداشت اور ثابت قدمی کو اجاگر کرنے کے لئے دسویں محرم کی گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے کہ اتنی زوروں کی گرمی میں بھی قافلہ راہِ حق کے پایہ استقلال میں لغزش نہیں آئی تھی۔

بند نمبر 6:

گرداب پر تھا شعلہ جَوالہ کا گُماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ، مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمی روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی، کباب تھی

تشریح:

میر ببر علی انیسؔ بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھے۔ نظم "میدان کربلا میں گرمی کی شدت" ان کے ایک طویل مرثیے کا حصہ ہے، جس میں تخیل اور لفظی تصویر کاری سے میدان کربلا میں گرمی کی شدت کی منظر کشی کی گئی ہے۔

میر انیسؔ میدانِ کرب وبلا میں گرمی کی شدت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دریا میں موجود بھنور پر گھومتے ہوئے شعلے کا گماں ہوتا تھا۔ گویا پانی اتنا گرم ہو چکا تھا کہ گرداب پر دہکتے الاؤ اور گھومتے ہوئے شعلے کا گماں ہوتا تھا۔ بلبلے گرمی کی شدت سے انگاروں میں تبدیل ہو چکے تھے اور پانی چنگاریاں اڑا رہا تھا۔ پانی کی تمام موجیں بے چین تھیں اور مارے گرمی کے ان کی زبانیں منہ سے باہر لٹک رہی تھیں۔ جیسے جانور گرمی سے بے حال اور نڈھال ہو کر زبانیں باہر نکال لیتے ہیں اسی طرح لہریں بھی گرمی سے بے حال ہو چکی تھیں۔ اتنی شدید گرمی تھی کہ پانی میں رہنے والے بڑے جانور جیسے مگر مچھ، زیرِ آب تھے اور گرمی کی حدت و شدت سے بچنے کے لیے تہہ میں پناہ لیے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی جان لبوں پہ آئی ہوئی تھی۔ گرمی کی حدت وہاں بھی پوری آب وتاب سے موجود تھی۔ پانی آگ کی مانند گرم تھا اور اتنی شدید گرمی تھی کہ روز قیامت کا گماں ہوتا تھا۔ قیامت کے دن جب سورج سوا نیزے پر ہو گا تو شدید گرمی ہو گی اور شدتِ گرمی سے انسانوں کی زبانیں باہر لٹک رہی ہوں گی۔ اور زمین تانبے کی طرح سرخ ہو گی۔ دسویں محرم کو بھی اتنی گرمی تھی کہ قیامت کا دن محسوس ہوتا تھا۔ گرمی کی انتہا کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پانی کھول رہا تھا اور وہ مچھلی جو موج کی سیخ تک یا سطحِ آب تک آتی کباب کی مانند بھن جاتی۔ میر انیسؔ نے معرکہ حق و باطل جو حسینی (رضی اللہ) قافلے اور یزیدی فوجوں کے درمیان ہوا تھا اس دن کی گرمی کو بیان کر کے امام حسین (رضی اللہ) اور ان کے رفقاء کے جذبہ ایثار اور ثابت قدمی کو نمایاں کیا ہے کہ اتنی شدید گرمی میں بھی وہ حق کے لئے ڈٹے ہوئے تھے۔

16 ۔ فاطمہ بنت عبداللہ

علامہ محمد اقبالؔ

بند نمبر1:

فاطمہ تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

مفہوم:

فاطمہ! تو نے جاںنثاری سے امتِ مرحوم کی آبرو رکھ لی ہے۔ تیرا مٹھی بھر مٹی کا پیکر اور قبر کا ذرہ ذرہ معصوم ہے۔

تشریح:

علامہ اقبال ہمارے قومی و ملی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے برصغیر کے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کیا۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے کمسن فاطمہ کے جذبہ حریت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اور مسلمانوں کو اس جذبے کو مشعلِ راہ بنانے کی ترغیب دی ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں علامہ اقبالؔ فاطمہ بنت عبداللہ کو ملت اسلامیہ کی حرمت و آبرو اور معصوم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ فاطمہ ملت مرحوم کی آبرو ہے۔ وہ ملت جو اپنی درخشندہ روایات اور عظمت و رفعت کو بھول چکی ہے، فاطمہ نے قرون اولٰی کے مسلمانوں کے سے جذبے کا مظاہرہ کر کے اس کی آبرو رکھ لی ہے۔ فاطمہ جیسے افراد سے ہی یہ قوم بامِ عروج تک پہنچی تھی اور اب بھی اس زوال پذیر امت کی آبرو رکھنے کا کام فاطمہ نے کیا ہے۔ اس نے کم سن ہو کر عظیم جذبے کا مظاہرہ کیا وہ معصوم پیکر اور مجسمہ حریت تھی۔ جس مشت خاک سے اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کا ذرہ ذرہ معصوم تھا۔ وہ دس سال کی تھی جب اس نے اپنی جان ملت پر نثار کر دی۔ اس کی قربانی لائق تحسین ہے۔

1911ء میں اٹلی کی فوجوں نے بحیرہ روم عبور کر کے لیبیا پر حملہ کر دیا۔ مقامی قبائل نے اپنی آزادی کے لیے قابض فوجوں کے خلاف جہاد شروع کیا طرابلس میں ان قابض فوجوں کے خلاف ایک عرب سردار عبداللہ بھی مصروف جہاد تھا جسے ترکوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ عبداللہ کی 10 سالہ کم سن بیٹی فاطمہ میدان جہاد میں مصروف عمل مجاہدین کی بندوقیں صاف کرتی تھی۔ فاطمہ نے بھی میدان کارزار میں جانے کی شدید خواہش ظاہر کی۔ فاطمہ کی ماں سارہ نے مخالفت کی۔ فاطمہ نے ضد کی تو اس کے باپ نے سارہ سے کہا کہ بیٹی کو اس نیک کام سے نہ روکے۔ فاطمہ میدان جہاد میں غازیوں کو پانی پلانے کا فرض سرانجام دیتے ہوئے شہید ہو گئی۔

علامہ اقبالؔ نے اسی کمسن فاطمہ کی فقید المثال قربانی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ درحقیقت اس دور میں امت مسلمہ زوال کا شکار ہو چکی تھی اور مسلمان بالخصوص برصغیر میں غلامی کا شکار تھے۔ وہ اپنے اسلاف کی عظمت و رفعت کو کھو چکے تھے اپنے آباؤ اجداد جیسے مسلمان نہیں رہے تھے۔ ملت اسلامیہ ملت مرحوم ہو چکی تھی۔ لیکن فاطمہ نے کم سن ہو کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے سے شوق شہادت اور جذبہ حریت کا مظاہرہ کیا۔ علامہ نے اسی لیے فاطمہ کو ملت مرحوم کی آبرو قرار دیا ہے۔ یہ اس امت پر رحم ہے کہ اس امت میں فاطمہ جیسے افراد بھی باقی ہیں۔ وہ معصومیت کا پیکر تھی، کم سن تھی اس کا جذبہ جہاد مثالی تھا۔ اس کا جذبہ تھا کہ اٹلی کی فوجوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ہمارے ملک اور ہماری قوم پر حملہ آور ہو میں

قابض افواج کو یہاں سے نکال کر دم لوں گی۔ چنانچہ اسی کام کے دوران وہ شہید ہو گئی۔ اس نے چھوٹی عمر میں بڑا کام کیا۔ مسلمانوں کے جذبے اس سے مہمیز ہوں گے اور مسلمان اپنی نشاۃ ثانیہ کے لئے میدان عمل میں رہ نوردِ شوق ہوں گے۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

بند نمبر 2:

یہ سعادت حورِ صحرائی تیری قسمت میں تھی
غازیانِ دین کی سقائی تیری قسمت میں تھی

مفہوم:

صحرا کی حسین بچی یہ تیری خوش قسمتی تھی کہ تم اللہ کی راہ میں لڑنے والوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو جاؤ۔

تشریح:

قومی و ملی شاعری علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری سے برصغیر کے خواب غفلت کا شکار مسلمانوں کو بیدار کرنے کا کام لیا۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے کم سن فاطمہ کی عظیم قربانی کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس قربانی کو دیکھتے ہوئے نئے زمانے، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی نوید دی ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں علامہ اقبالؔ فاطمہ بنت عبداللہ کی غازیان دین کو پانی پلانے کی عظیم سعادت کو خوش قسمتی قرار دیتے ہیں اور فاطمہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فاطمہ بنت عبداللہ نے کم سنی کے باوجود عظیم ترین جذبے کا مظاہرہ کیا۔ گولہ و بارود کی گھن گرج میں بھی بہادری سے غازیانِ دین کو پانی پلانے کا فریضہ سرانجام دیتی رہی۔ فاطمہ ریگستان کی صالح ترین بچی تھی اس کے حصے میں یہ سعادت آئی کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی سقائی کرے۔ یہ اس کی خوش بختی بھی تھی اور جذبہ ایمانی کی عظمت بھی۔ وہ حورِ صحرائی تھی۔

شہر میں بسنے والے کیا جانیں شہر تو بنجر ہوتے ہیں
صحراؤں میں رہنے والے لوگ سمندر ہوتے ہیں

فسطائیت کے پیروکار اطالویوں نے بحیرہ روم عبور کر کے 1911ء میں لیبیا کے شہر طرابلس (ٹریپولی) پر حملہ کر دیا اور قابض ہو گئے۔ مقامی مسلمان آبادی نے غیر ملکی تسلط کو قبول نہ کیا اور آزادی کے لیے جہاد شروع کر دیا۔ ان میں عرب سردار عبداللہ بھی لڑ رہا تھا جس کی مدد ترک کر رہے تھے۔ عبداللہ کی بیٹی دس برس کی تھی وہ میدان جنگ سے کچھ دور خیمے میں بندوقیں صاف کرتی تھی۔ فاطمہ نے اپنے والد عبداللہ اور ماں سارہ سے ضد کر کے میدان جہاد میں جانے کی اجازت لی۔ ترک سردار احمد نوری نے اسے پانی کا مشکیزہ لا دیا۔ وہ پانی بھرتی اور دن بھر غازیان دین

اور زخمیان جنگ کو پانی پلانے کا فرض ادا کرتی۔ جنگ کی تمام تر سختیوں میں وہ بہادری سے اپنا کام جاری رکھتی۔ اس نے اس جذبہ ایمانی کا مظاہرہ تب کیا جب ہر جگہ مسلمان بالخصوص برصغیر میں زوال پذیر تھے اس حالت میں ایک مسلمان بچی کا یہ غیر معمولی جذبہ تھا۔

علامہ اقبالؔ نے فاطمہ کے اسی فقید المثال جذبے کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کی خوش بختی پر ناز کیا ہے۔ اور ایسی بچی کے ایسے غیر معمولی عمل کو امت کی بیداری سے تعبیر کیا ہے کہ شرق سے غرب تک مسلمان جو اپنا رتبہ اور شان کھو چکے ہیں ابھی ان کی نسل نو میں فاطمہ بنت عبداللہ ایسی شمعیں موجود ہیں جو اس غلامی کی رات کو آزادی کی صبح میں تبدیل کریں گی۔ یہ لوگ اپنی جان دے کر امت کی بقا کا باعث بنیں گے اور خود بھی امر ہو جائیں گے۔

فنافی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

بند نمبر 3

یہ جہاد اللہ کے راستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

مفہوم:

بغیر تلوار اور ڈھال کے اللہ کے راستے میں جہاد اور تیرا شوق شہادت کس قدر جسارت آفریں ہے۔

تشریح:

مشہور فلسفی شاعری علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری سے ملت اسلامیہ کے خواب غفلت کے شکار جسم میں نئی روح پھونکی۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی کم سن فاطمہ پر تحسین کے پھول نچھاور کیے ہیں۔

زیر تشریح شعر میں ملی شاعر علامہ اقبالؔ فاطمہ بنت عبداللہ کے شوقِ شہادت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فاطمہ نے اللہ کی راہ میں بغیر تلوار اور ڈھال کے جہاد کیا۔ وہ اللہ کے راستے میں شہید ہونے کے جذبے کے تحت میدان جہاد میں اتری۔ اس کا شوق شہادت کس قدر جسارت آفریں تھا۔ عظمت رفتہ کو کھو دینے والے کمزور مسلمانوں میں فاطمہ نے کمسنی کے باوجود قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے سے جذبے کا مظاہرہ کیا۔ وہ غیر ملکی جبر واستبداد کے خلاف لیبیائی مسلمانوں کی آزادی کے لئے کٹ مرنے کے لیے میدان کارزار میں اتری تھی۔ چھوٹی عمر میں اس نے بڑے عظیم جذبے کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کا یہ جذبہ بہت لائق تحسین ہے۔

ٹوٹی پھوٹی تلواروں میں کیا بجلی تھی کیا شعلہ تھا
جہاں "فاطمہ بنت عبداللہ" نے اللہ اکبر بولا تھا

مسولینی کے اٹلی نے اپنی عسکری طاقت کے بل بوتے پر بحیرہ روم عبور کر کے لیبیائی طرابلس پر حملہ کر دیا۔ 1911ء کے کمزور مسلمانوں نے اپنی مدد آپ کے تحت غیر ملکی فوجوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ ان مجاہدین میں ایک عرب سردار عبداللہ بھی تھا۔ عبداللہ کی بیٹی فاطمہ جو دس برس کی تھی جنگ کے میدان سے کچھ دور بندوقیں صاف کرتی تھی۔ اس نے ضد کر کے اپنے والد عبداللہ اور ماں سارہ سے میدان جہاد میں جانے کی اجازت لی اور منہ بولے چچا، ترک سردار احمد نوری سے مشکیزہ لیا اور پانی سے بھر بھر کے غازیان اسلام اور زخمیان جنگ کی پیاس

بجھانے لگی۔ جنگ اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جاری تھی لیکن یہ کم سن بچی گھبرائی نہیں۔ سقائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے وہ راہِ حق میں شہید ہو کے اَمر ہو گئی۔

ملی شاعر علامہ اقبال نے اس کمسن مجاہدہ کے جذبہ شہادت کی توصیف بیان کی ہے۔ فاطمہ کمسن ہو کر ضد کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے گئی۔ نہ تلوار، نہ ڈھال، بغیر اسلحے کے وہ میدانِ جنگ میں غازیان دین کی مدد کے لیے گئی اور ان کی پیاس بجھانے کا فرض نبھاتی رہی۔ وہ ملی آزادی کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھی۔ اس کا شوقِ شہادت لائق تحسین وافتخار تھا۔ اس عمر میں بچے کھیلنے کا شوق رکھتے ہیں۔ فاطمہ جان پر کھیل گئی۔ اس عہد میں مسلمان دنیا پرست بن چکے تھے۔ فاطمہ نے اخروی ثمرات سمیٹے۔

وہ ریگستانوں کی سرزمین کو لہو سے سیراب کر گئی
شہید ہو کے نکھر گئی بشکلِ خوشبو بکھر گئی

بند نمبر 4

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

مفہوم:

امت مسلمہ کے خزاں رسیدہ گلشن میں ایسی کلی ابھی موجود تھی۔ امت مسلمہ جو راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے اس میں ایسی چنگاری موجود تھی۔

تشریح:

ملی شاعر علامہ اقبالؒ نے اپنی انقلابی شاعری سے برصغیر کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام لیا۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں اقبال نے طرابلس کی جنگ میں غازیانِ دین کو پانی پلانے والی کمسن مجاہدہ فاطمہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زیر تشریح شعر میں اقبالؒ نے فاطمہ بنت عبداللہ کو خزاں رسیدہ گلستان میں تازہ کلی اور خاکستر میں چنگاری سے تعبیر کیا ہے۔ جب ملت سے شوق شہادت مفقود ہو چکا تھا۔ جب ملت عظمت رفتہ کھو چکی تھی اور رتبہ وشان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ جب قوم میں نہ روح بلالی (رضی اللہ) تھی اور نہ جذبہ شبیری (رضی اللہ) تھا۔ خاور سے باختر تک مسلمان پستی کا شکار تھے سوائے خلافت ترکیہ کے۔ برصغیر کے مسلمان بالخصوص غلامی کا شکار ہو چکے تھے۔ گویا مسلمانوں کا گلستان خزاں رسیدہ ہو چکا تھا اور فقید المثال جذبہ جہاد خاک ہو چکا تھا۔ ایسے میں فاطمہ بنت عبداللہ نے قرون اولی کے مسلمانوں کے سے جذبہ حریت اور شوق شہادت کا مظاہرہ کیا۔ گویا اس خزاں رسیدہ قومی چمن میں ایک تازہ کلی باقی تھی۔ ایسے وقت میں جب مسلمان راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ ایسے میں اس راکھ میں ایک چنگاری موجود تھی جس سے عظمتِ رفتہ حاصل کرنے کے جذبے کی آگ جلے گی اور اس ملت کی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنے گی۔

فسطائیت پرست اطالوی فوجوں نے 1911ء میں بحیرہ روم عبور کر کے لیبیائی مسلمانوں کو محکوم بنانے کے لیے طرابلس (ٹریپولی) میں فوج کشی کی۔ مقامی مسلمانوں نے جہاد شروع کیا۔ مجاہدین میں سے ایک عرب سردار عبداللہ کی بیٹی فاطمہ نے ماں باپ سے ضد کر کے میدان جنگ میں جانے کی اجازت لی۔ اس وقت اس کی عمر دس برس تھی وہ طرابلس میں غازیان اسلام کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئی۔ وہ کمسن تھی لیکن عظیم جذبہ جہاد سے سرشار تھی۔

علامہ اقبالؔ نے فاطمہ کی اسی قربانی کی تحسین کی ہے اور نئے زمانے کی نوید قرار دیا ہے۔ ملت کے گلشن میں پت جھڑ عروج پر تھا لیکن فاطمہ نے غنچہ و کلی بن کر نویدِ بہار دی۔ اقبال پُر امید ہیں کہ ابھی نسل نو میں ایسے افراد خواہ کم سن ہی سہی لیکن موجود ہیں جو اس کے تحفظ اور دوبارہ عروج کا باعث بنیں گے۔

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے

ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

بند نمبر 5

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

مفہوم:

امت مسلمہ کے ریگستان میں ابھی بہت سے ہرن چھپے ہوئے ہیں امت کا بادل جو آدھی دنیا پر برس چکا اس میں ایسی بجلیاں سوئی ہوئی ہیں جو اسے دوبارہ برسائیں گی۔

تشریح:

حال و فراد کے نقیب شاعر علامہ اقبالؔ ہماری ملی شاعر ہیں۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے طرابلس کی جنگ میں غازیان راہِ خدا کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی فاطمہ کی فقید المثال قربانی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

زیر تشریح شعر میں اقبالؔ نے فاطمہ بنتِ عبداللہ کی قربانی کو دیکھتے ہوئے ایسے مزید خوابیدہ اور پوشیدہ مجاہدین کی نوید دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قومی چمن بے آب و گیاہ صحرا میں بدل چکا ہے لیکن اس میں بہت سے ہرن بھی چھپے ہوئے ہیں اگرچہ قومی بادل برس برس کر مزید برسنے کی طاقت سے عاری دکھائی دیتا ہے لیکن اس برسے ہوئے بادل میں بہت سی بجلیاں چھپی ہوئی ہیں جو اس بادل کو پھر موسلادھار بارش برسانے کی طاقت عطا کر سکتی ہیں۔ علامتی انداز میں اقبالؔ نے اشارہ دیا ہے کہ جس طرح فاطمہ نے کم سنی کے باوجود عظیم جذبہ جہاد کا مظاہرہ کیا اس سے صاف عیاں ہے کہ ایسے کئی اور مجاہدین ملت ابھی پس پردہ موجود ہیں جو اس زوال رسیدہ امت کے اقبال کا باعث بنیں گے۔ فسطائی اطالوی فوجوں نے بحیرہ روم عبور کر کے لیبیائی طرابلس پر حملہ کر دیا۔ مقامی قبائل نے جہاد منظّم کیا۔ ان مجاہدین میں عرب سردار عبداللہ بھی تھے جن کی دس سال کی بیٹی فاطمہ نے ماں باپ سے ضد کر کے میدان جہاد میں جانے کی اجازت لے لی۔ وہ چمڑے کے مشکیزے میں پانی بھر بھر کے میدان جہاد میں مصروفِ عمل غازیان دین کی پیاس بجھاتی تھی۔ اسی فرض کی ادائیگی کے دوران وہ شہید ہوئی۔ اس کی کم سنی کے عظیم عمل اور شوق شہادت کو دیکھتے ہوئے اقبالؔ پُر امید ہیں کہ ایسے پُر عزم مجاہدین اس امت میں پس پردہ موجود ہیں جو کہ ابھی سامنے نہیں آئے۔ اگرچہ اس قوم میں قحطِ انسان ہے لیکن ابھی اس ریت میں ریزہ زر موجود ہیں ان سنگریزوں میں کچھ گوہر چھپے ہوئے ہیں۔ پورے قومی افق پر خزاں چھائی ہوئی ہے لیکن چند کلیاں ابھی موجود ہیں جو اس خزاں کو بہار میں بدل سکتی ہیں۔ چند غنچے موجود ہیں جو چٹخ کر اس خزاں رسیدہ چمن کو رنگ و بُو سے بھر دیں گے۔ اس قوم میں ایسے مردانِ مجاہد ابھی ہیں جو اسے ماضی کی سی عظمت و رفعت عطا کریں گے۔

چھپے سنگریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ

ملے ریت میں ریزہ زر بھی ہیں کچھ

بند نمبر 6

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمہ عشرت بھی اپنے نالہ ماتم میں ہے

مفہوم:

اگرچہ میری آنکھیں فاطمہ کی کم سنی کی شہادت پر رو رہی ہیں لیکن میرے نوحوں میں خوشی کے گیت بھی ہیں۔

تشریح:

حکیم حیات علامہ اقبالؒ مشہور فلسفی شاعر اور امروز و فردا کے نقیب تھے۔ ان کی ملی شاعری نے برصغیر کے مسلمانوں کو ولولہ تازہ دیا۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے طرابلس کی جنگ میں غازیانِ دین کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی کمسن مجاہدہ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

زیر تشریح شعر میں علامہ اقبالؒ فاطمہ بنت عبداللہ کے لئے اشک بار بھی ہیں اور اس کی قربانی اور شوق شہادت پر مسرور بھی۔ وہ فاطمہ کے عمل عظیم میں کھوئے ہوئے اس سے غائبانہ طور پر مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ فاطمہ ! اگرچہ میں تیری کم سنی کے وصال پر اشک بار ہوں غمزدہ ہوں اور آہ وزاری کر رہا ہوں لیکن میرے دل میں تیری عظیم قربانی، تیرے فقید المثال شوقِ شہادت کے باعث مسرت اور میری زبان پر نغمہ عشرت بھی ہے۔ مقام شکر ہے، باعث صد افتخار ہے کہ میری قوم میں ایسی بچی موجود تھی جس نے آبروئے قوم اور آزادی ملت کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کیا۔

پس منظر یوں ہے کہ اٹلی کے فسطائی حکمرانوں نے اپنی فوجوں کو بحیرہ روم عبور کر کے لیبیا پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ اطالوی فوجوں نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ مقامی مسلمانوں نے جہاد برپا کیا۔ ان مجاہدین میں عرب سردار عبداللہ بھی تھے۔ عبداللہ کی کمسن دس سال کی بیٹی فاطمہ نے ماں باپ سے ضد کر کے میدان جہاد میں جانے کی اجازت لے لی۔ وہ غازیانِ دین کو پانی پلانے کا فرض سرانجام دیتے ہوئے شہید ہوئی۔

علامہ اقبال نے فاطمہ کی اسی قربانی کی تحسین کی ہے۔ علامہ ایک طرف اس کی نو عمر کی موت پر نوحہ کناں ہیں اور دوسری طرف شادماں کہ امت میں ابھی ایسے شوقِ شہادت سے سرشار افراد باقی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فاطمہ نے 10 سال کی عمر میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ یہ عمر تو کھیلنے کی ہے اس عمر میں تو قوم اپنے بچوں کا سایہ عاطفت ہوتی ہے لیکن فاطمہ جیسی بچی میدان جہاد میں شہید ہو گئی۔ یہ المیہ ہے اور اقبالؒ اس پر اشکبار ہیں لیکن دوسری طرف ایسے وقت میں جب ملت پر کڑا اور براوقت ہے۔ مسلمان اپنے اسلاف کے خصائص سے محروم ہو چکے ہیں۔ فاطمہ نے اسلاف جیسے شوق شہادت اور جذبہ حریت کا عملی مظاہرہ کر کے قوم کی آزادی کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ اس پر اقبالؒ مسرور شادمان ہیں کہ قوم میں ایسی بچی موجود تھی جس کی قربانی پوری ملت کو غیرت وحمیت کا احساس دلائے گی۔

بند نمبر 7

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

مفہوم:

تیری خاک کا رقص خوشی دے رہا ہے اور اس کا ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے۔

تشریح:

شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبالؔ قومی و ملی شاعر تھے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے برصغیر کے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کا کام لیا۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے طرابلس کی جنگ میں غازیانِ اسلام کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی فاطمہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں علامہ اقبالؔ فاطمہ بنت عبداللہ کی عظیم قربانی، جذبہ ایمانی اور شوقِ شہادت کی تحسین بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فاطمہ نے کم سنی میں ملت کے لئے جان قربان کرکے اسلاف کے سے خصائل کا حامل ہونے کا مظاہرہ کیا۔ صغر سنی میں وہ راہِ خدا میں اپنی زندگی قربان کرکے منّوں مٹی کے نیچے دفن ہوگئی۔ صحرائی ہواؤں سے جب اس کی قبر کی مٹی اڑتی ہے تو قومی درد رکھنے والے لوگوں کی خوشی دوچند ہو جاتی ہے۔انہیں اس کا عظیم کارنامہ اور فقید المثال جوشِ شہادت یاد آنے لگتا ہے اور اپنی قوم کی اس مایہ ناز سپوت پر فخر محسوس ہوتا ہے۔اگرچہ قوم زوال رسیدہ ہے لیکن اسی قوم میں اسلاف کی خوبیوں کی حامل فاطمہ بھی تھی جس نے دس برس کی عمر میں اللہ کی راہ میں جاں نثار کی۔ قبر کی اڑتی، رقص کرتی ہوئی خاک خوشی بڑھا دیتی ہے کہ یہ اس کم عمر کی قبر ہے جو ملت کی آزادی و حریت کے لیے راہِ خدا میں جان قربان کر گئی۔اسی خاک کا ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے بھرا ہوا ہے۔وہ کھیلنے کی عمر میں جہاد کرتی ہوئی شہید ہو گئی۔قبر کی خاک کا ہر ذرہ اس کی زندگی کے بارے گداز پیدا کرتا ہے۔ تو دوسری طرف اس کی زندگی قومی سوز سے بھی لبریز تھی کہ اپنی زندگی کی پرواہ کیے بغیر قوم کو زندگی دینے کے لیے شہید ہوئی۔اسی لئے تو شہید زندہ ہوتے ہیں۔

"اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کا شعور نہیں رکھتے"۔(القرآن)

بند نمبر 8:

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

مفہوم:

فاطمہ کی خاموش قبر میں کوئی ہنگامہ برپا ہے۔ایک قوم تازہ اس آغوش میں پل رہی ہے۔

تشریح:

حکیم الامت علامہ محمد اقبال ملی شاعر تھے۔وہ امروز و فردا کے نقیب تھے۔انہوں نے اپنی شاعری سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا کام لیا۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے طرابلس کی جنگ میں غازیانِ دین کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی کمسن مجاہدہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں علامہ اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ کی قربانی کے پس منظر میں قوم کو نئے زمانے کی نوید دی ہے۔دس سال کی بچی جس طرح شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر میدان کارزار میں کود پڑی اور جان راہِ حق میں نثار کر دی اس سے صاف عیاں ہے کہ اس کی خاموش قبر اور خاموش قربانی کے پس پردہ کوئی ہنگامہ پوشیدہ ہے اور اِک نئی قوم اسلاف کے سے جذبے سے تیار ہو رہی ہے۔ایسے وقت جب قوم اسلاف کی خوبیوں سے محروم ہو چکی ہے۔وہی قوم جو نیل سے کاشغر تک چھائی ہوئی تھی، اب زوال رسیدہ ہے۔یہ امت برصغیر میں بالخصوص غلام ہے۔اسی

ملت میں اپنے اسلاف کا ساجذبہ ایمانی، روحِ بلالی، ولولہ شبیری رکھنے والی کمسن مجاہدہ ملت کے لئے جان قربان کردے، ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ قوم میں قحط انسان ضرور ہے لیکن ابھی ایسے افراد موجود ہیں جو آباؤاجداد جیسے خصائل کے حامل ہیں۔ اس دورِ زوال میں قومی بیداری، حرمت و آزادی کے لئے تن من دھن نثار کرنے والے موجود ہیں اگر یہی جذبہ نسل نو میں کارفرما ہے تو یقیناً ایسی قوم پل رہی ہے جو دوبارہ رتبہ اور شان حاصل کرے گی اور اپنے اسلاف کی طرح علم و فن میں یکتا ہو گی۔ شوقِ شہادت سے سرشار ہو گی اور فقید المثال حکمرانی کرنے والی ہو گی۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

1911ء میں فسطائی اطالویوں نے بحیرہ روم عبور کر کے لیبیائی طرابلس پر قبضہ کر لیا تو مقامی مسلمانوں نے اس غیر ملکی تسلط کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان مجاہدین میں ایک عرب سردار عبداللہ بھی تھے جن کی کمسن بیٹی فاطمہ نے ماں باپ سے ضد کر کے میدانِ جہاد میں جانے کی اجازت لی اور غازیانِ دین کی سقائی کرنے لگی۔ اسی بے تیغ و سپر جہاد میں وہ شہید ہو گئی۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اک کم سن دس سالہ مجاہدہ کے شوق شہادت اور جذبہ حریت کا یہ عالم ہے تو اک قوم تازہ کی نوید ہو۔ اک ہنگامہ اس پس منظر میں پوشیدہ ہے۔ یہ قوم خوابیدہ ضرور ہے لیکن جاگنا چاہتی ہے۔ اسلاف کے خصائل سے لبریز قوم منصہ شہود پہ آنے والی ہے۔

بند نمبر 9

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور

دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

مفہوم:

امت مسلمہ کے آسمان کی فضا میں نئے ستارے ظہور پذیر ہو رہے ہیں جن کی موجِ نور سے ابھی انسانی آنکھ ناواقف ہے۔

تشریح:

ملی شاعر علامہ محمد اقبال امروز و فردا کے نقیب تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے خوابیدہ ملت کی بیداری کا کام لیا۔ نظم فاطمہ بنتِ عبداللہ میں انہوں نے طرابلس کی جنگ میں غازیانِ دیں کی سقائی کے دوران میں شہید ہونے والے کم سن مجاہدہ فاطمہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں اقبالؔ نے فاطمہ بنت عبداللہ کی قربانی کے پس منظر میں افق قوم پر نئے درخشندہ افراد کے ظہور کی نوید دی ہے۔ دس سالہ کمسن مجاہدہ اگر اس شوق شہادت اور جذبہ ایمانی سے لبریز و سرشار ہے تو صاف ظاہر ہے کہ نسل نو سے نئے ستاروں کا ظہور ہو گا، نئے افراد زوال رسیدہ قوم کو ماضی کی سی عظمت دلانے کے لیے میدان عمل میں اتریں گے۔ قوم کے مجموعی منظر سے دلگیری اور نمدیدگی محسوس ہوتی ہے لیکن اس راکھ میں ایسی چنگاریاں پوشیدہ ہیں اور قومی فلک کے منظر نامے پر ایسے ستارے نمودار ہو رہے ہیں جن کی تابندگی کا انسانی آنکھ ادراک نہیں رکھتی۔

شرق و غرب میں مسلمان زوال رسیدہ تھے۔ اسی کمزوری کی بنا پر فسطائی اطالویوں نے بحیرہ روم عبور کر کے لیبیائی طرابلس پر فوج کشی کر دی۔ مقامی غیرت مند مسلمانوں نے غیر ملکی تسلط کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان مجاہدین میں سے ایک عرب سردار عبداللہ تھے جن کی کمسن دس سالہ بیٹی نے ماں باپ سے ضد کر کے اس جہاد میں شرکت کی اجازت لی۔ فاطمہ غازیانِ دین کو پانی پلانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے شہید

ہو گئی۔ دس سال کی عمر میں جس عظیم قربانی، فقید المثال شوقِ شہادت اور جذبہ ایمانی کا مظاہرہ فاطمہ نے کیا اس سے یہ بات عیاں ہے کہ اس قوم میں بالخصوص نسل نو میں ایسے پس پردہ افراد موجود ہیں۔ یہ قوم اگرچہ راکھ کا ڈھیر بن چکی لیکن اس میں ایسی چنگاریاں موجود ہیں جو شعلہ جوالہ کا روپ دھار سکتی ہیں۔ ریت کے اس انبار میں ریزہ زر ہیں اور ان سنگریزوں میں وہ گوہر ہیں جو قومی افق پر چھائے غلامی اور پستی کے منظر نامے کو بدل سکتے ہیں۔ نئی نسل میں اسلاف کا ساجذبہ ایمان، روح بلالی (رضی اللہ)، ولولہ شبیری موجود ہے۔ یہ نسل نیل سے تابخاک کاشغر اس قوم کو ماضی کا سار تبہ اور شان عطا کرے گی۔ ایسے افراد چونکہ ابھی منصئہ شہود پر نہیں آئے اس لئے تمام افراد کو ان کا ادراک نہیں ہے لیکن فضائے آسمان پہ ان ستاروں کا ظہور جلد ہو گا اور قوم تازہ تشکیل پائے گی۔ علامہ اقبال کی پیش بنی درست ثابت ہوئی۔ وہ امت میں جو بیداری کی لہر دیکھ رہے تھے اس کا ہر ایک کو اندازہ نہیں تھا۔ شمالی افریقہ، برصغیر، مشرق بعید، بلقان کی ریاستیں، سب جگہوں پہ بیداری کی لہر پیدا ہوئی اور یہاں کے مسلمان آزادی سے ہمکنار ہوئے۔

بند نمبر 10

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نَو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتَو بھی ہے

مفہوم:

ان ستاروں کی چمک دمک میں پرانا انداز بھی ہے اور نیا بھی۔ ان ستاروں پر تیرے قسمت کے ستارے کا عکس بھی ہے۔

تشریح:

حکیم الامت، حکیمِ حیات ڈاکٹر علامہ محمد اقبال امروز و فردا کے نقیب تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کے نیم مردہ جسم میں نئی روح پھونکی۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ میں انہوں نے لیبیائی طرابلس کی جنگ میں غازیانِ اسلام کو پانی پلاتے ہوئے شہادت پانے والی فاطمہ بنت عبداللہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں اقبالؔ نے فاطمہ بنت عبداللہ کی عظیم قربانی، شوق شہادت اور جذبہ ایمانی کے پس منظر میں ملی منظر نامے میں نئے دور کی نوید دی ہے۔ کم سن دس سالہ مجاہدہ نے جو فقید المثال قربانی دی اس سے صاف عیاں ہے کہ قومی افق پر نئے انجم کا ظہور ہو چکا۔ نسلِ نَو میں ایسے صاحبانِ عمل نمو پا رہے ہیں جو اس غلام قوم کو پستی سے نکالیں گے لیکن عام افراد اس کا ادراک نہیں رکھتے۔ یہ نئے انجم پرانا انداز بھی رکھتے ہیں اور نیا بھی۔ یہ افرادِ قوم قرونِ اولی کے مسلمانوں کا ساجذبہ ایمانی اور شوق شہادت بھی رکھتے ہیں اور نئے دور کی تخلیق کی صلاحیت بھی۔ یہ اپنے اسلاف کے خصائص بھی رکھتے ہیں اور عصری تقاضوں سے نبرد آزمائی کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔ ان میں وہی جذبہ شوق ہے جس سے فاطمہ بنت عبداللہ لبریز تھی۔

فسطائیت کے پرستار اطالویوں نے بحیرہ روم عبور کر کے لیبیائی طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ مقامی غیرت مند مسلمانوں نے غیر ملکی تسلط کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان مجاہدین میں سے ایک عرب سردار عبداللہ کی دس سالہ کمسن بیٹی فاطمہ نے والدین سے ضد کر کے جہاد میں جانے کی اجازت لی۔ وہ میدان جنگ میں غازیان اسلام کو پانی پلانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے شہید ہو گئی۔

اقبالؔ نے فاطمہ کے اسی شوقِ شہادت اور جذبہ ایمانی سے یہ اخذ کیا ہے کہ ایک کمسن دس سالہ بچی میں یہ جذب و شوق ہے تو نسلِ نَو میں بہت سے ایسے افراد پس پردہ ہیں جو اپنے آباؤ اجداد قرونِ اولی کے مسلمانوں جیسے خصائص کے حامل ہیں اور جدت بھی رکھتے ہیں۔ قومی افق کے یہ

نئے ستارے پرانی تابانی بھی رکھتے ہیں اور ان میں نئی درخشندگی بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں فاطمہ کی قسمت کے ستارے کا عکس ہے۔ جوں جوں یہ افراد قومی منظر نامے پر ظہور پذیر ہوں گے۔ ملی نشاۃ ثانیہ شرق و غرب میں روبہ عمل ہوتی جائے گی۔ اقبالؔ کی یہ پیش بینی درست ثابت ہوئی۔ کے مسلمانوں نے لاالٰہ کے نام پر ایک آزاد ملک بنایا۔ شمالی افریقہ کے تمام ممالک نے غیر ملکی تسلط سے آزادی حاصل کی حتیٰ کہ یہ منظر نامے مشرق بعید سے بوسنیا اور کوسووتک دکھائی دیے۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

17 ۔ کسان

(جوش ملیح آبادی)

بند نمبر1

جُھٹ پٹے کا نرم رودر یا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

مفہوم:

شام کا جھٹ پٹ ہو گیا افق پر شفق ڈھلنے کو ہے سورج غروب ہو چکا۔ کھیتوں اور میدانوں میں خاموشی چھا چکی ہے۔

تشریح:

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی ممتاز نظم گو شاعر تھے۔ رومانوی اور ترقی پسندانہ شاعری ان کی نظموں کا خاص عنصر ہے۔ نظم کسان میں انہوں نے دہقاں کی محنت ومشقت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں جوش کہتے ہیں کہ سورج غروب ہو چکا، شام نے اپنے پر پھیلا دیے۔ مکمل روشنی نہ مکمل اندھیرا۔ شام کے جھٹ پٹے کا نرم رود ریا اپنی نامکمل تیرگی لیے رواں دواں ہے۔ دور مغرب کی سمت افق پر شفق کی سرخی بے تابی دکھا رہی ہے۔ دہقانوں کی محنت و مشقت کی گواہ کھیتیاں، ہرے بھرے گھاس کے میدان ہیں۔ پرندے گھونسلوں کو لوٹ چکے، مزدور گھروں کو لوٹ چکے، دن بھر کی سرگرمیاں ختم ہو چکیں۔ چہل پہل اور رونق تمام ہو چکی۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ ایسے میں طلوع صبح سے کھیتوں میں مشقت کر کے سونا گانے والا کسان جو پسینہ بہاتا ہے تو دنیا کو کھانے کو اناج ملتا ہے اور جانوروں کو چارہ اور پرندوں کو دانہ دُنکا، اپنے گھر کی طرف رواں دواں ہے۔ کسان بہادر، فراخ دلی اور محنتی ہے۔ وہ جان جوکھوں کی مشقت اور دھوپ چھاؤں سے بے نیاز، موسموں کی شدت کا مقابلہ کرتے ہوئے زمین کی زرخیزی سے زر کشید کرتا ہے اور ایک عالم پلتا ہے۔

"کسان جگ کا پالن ہار ہوتا ہے"

جوش ملیح آبادی نے کسان کی انتھک محنت کو خراج تحسین پیش کیا ہے کہ وہ کام کرتا ہے اور دنیا کھاتی ہے۔ ہل چلانا، بیجائی کرنا، سینچائی کرنا، فصلوں کی رکھوالی کرنا، گرمی سردی میں یہ تمام مراحل کسان کی جانفشانی اور سخت مشقت کی بدولت پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ کسان کی اس محنت کا ثمر دنیا کے مختلف طبقات کے مختلف افراد کھاتے ہیں۔ غروب ہوتا سورج، جھٹ پٹے کا نرم رودریا، سرخی شفق، کھیت کھلیان اور میدان کسان کی مشقت، ایثار اور عظمت کے گواہ ہیں۔۔

بڑا بہادر ہے محنتی کسان

بند نمبر2

یہ سماں اور ایک قوی انسان یعنی کاشتکار

ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار

مفہوم:

یہ منظر اور مضبوط انسان کسان جو کہ ارتقاء کا پیشوا ہے اور تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے والا ہے۔

تشریح:

جوش ملیح آبادی کا شمار ممتاز نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ رومانوی اور ترقی پسندانہ شاعری ان کی نظموں کا خاص عنصر ہے۔ نظم کسان میں انہوں نے کسان کی تہذیب و معاشرت کی نشو نما میں اہمیت، مشقت اور عظمت کو اجاگر کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں جوش کسان کی خصوصیت اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد کے وقت اک تنومند، محنتی اور مضبوط انسان یعنی زمین کی زرخیزی سے زر کشید کرنے والا انسان، کاشتکار گھر کو رواں دواں ہے۔ انس و چرند پرند کے ارتقا میں اس کا بنیادی کردار ہے۔ اس کے پسینے کی محنت سے وہ فصلیں اور اناج پیدا ہوتا ہے جس پر ایک جہاں پلتا ہے۔ از منہ ءقدیم سے جدید دور تک دہقان کی کھیتوں میں محنت یعنی ہل چلانا، بیجائی کرنا، سینچائی کرنا، فصلوں کی رکھوالی وہ جانکاہ کام ہے جس پر تہذیبوں نے پرورش پائی اور زندگی کے ارتقا کا انحصار رہا ہے۔ خوراک زندگی کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ انسان نے دریاؤں، ندی نالوں، بارانی علاقوں کے قریب اجتماعی زندگی کا آغاز کیا کہ وہاں کاشتکاری ممکن تھی۔ کاشتکار کے گرد وہ لوگ آباد ہوئے جو معاشرتی ضرورتوں کے کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی زندگی کا مدار بھی کاشتکار کا کام ہی تھا۔ پالتو جانور بدلے میں مالک کی ضرورت کو پورا کرتے لیکن ان کو پالنے کا کام کاشتکار کی محنت کے بل بوتے پر تھا۔ چنانچہ معاشرتی زندگی کے ارتقاء اور تہذیب کی تشکیل و تسلسل کا انحصار دہقان کی انتھک محنت پر رہا ہے۔ یوں کسان انسانی ارتقا کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار ہے۔

بند نمبر 3

جلوہ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ

ماہ کا دل۔ مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ

مفہوم:

کسان اللہ کے جلوؤں اور فطرتی حسن کا گواہ ہے۔ محنت کے سبب وہ چاند کا محبوب ہے اور چمکتے سورج کا سب سے پسندیدہ ہے۔

تشریح:

جوش ملیح آبادی کا شمار ممتاز نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ رومانوی اور ترقی پسندانہ شاعری ان کی نظموں کا خاص عنصر ہے۔ نظم کسان میں انہوں نے کسان کی تہذیب و معاشرت کی نشو نما میں اہمیت، مشقت اور عظمت کو اجاگر کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں جوش کسان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محنتی کسان طلوع صبح سے شام کے جھٹ پٹے تک کھیتوں میں مصروف کار رہتا ہے۔ وہ ہل چلاتا ہے، بیجائی کرتا ہے، سینچائی کرتا ہے اور زمین سے زر کشید کرتا ہے۔ زمین سے بیج بالیوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں جو رنگا رنگ پودوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ کچھ اناج کا منبع ہوتے ہیں، اناج کی ایک ایک بالی کئی کئی دانوں سے بھری ہوتی ہے۔ کچھ پودے پھل دار پیدا ہوتے ہیں جن پر مختلف ذائقوں کے پھل لگتے ہیں۔ رنگا رنگ پھولوں والے پودے الگ اسی زمین سے نمودار ہوتے ہیں۔

یہ قدرت کے معجزے اور جلوے ہیں جن کا گواہ کسان ہے۔ دراصل یہ سب اسی کی محنت کا ثمر ہے۔ اس قدرت کی کاریگری کا کسان گواہ ہے۔ فطرت کی رنگینی اور دلفریب حسن، کسان کی محنت کی کوکھ سے جلوہ نما ہوتا ہے۔ وہ جانکاہ مشقت کرتا ہے تو ایک ہی زمین سے مختلف ذائقے کے پھل، مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے پھول اور انواع واقسام کا اناج پیدا ہوتا ہے۔ کسان کی یہ محنت شب و روز جاری رہتی ہے۔ چاند کی چاندنی اس کی انتھک محنت کا بوسہ لیتی ہے تو حدت و نور بانٹتا سورج اسے پیار کرتا ہے۔ دراصل سورج کی روشنی اور حدت سے کسان کی محنت ہی صحیح مستفید ہوتی ہے، یوں کسان منبعِ نور کا نورِ نگاہ ہے۔

بند نمبر 4

لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو

مفہوم:

زمین سے نمودار ہوتی فصلوں کی رگوں میں اس کا لہو دوڑتا ہے اور اس کی محنت و ریاضت زمین سے رنگ و بو کا سیلاب نمودار کرتی ہے۔

تشریح:

جوش ملیح آبادی کا شمار ممتاز نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ رومانوی اور ترقی پسندانہ شاعری ان کی نظموں کا خاص عنصر ہے۔ نظم کسان میں انہوں نے کسان کی تہذیب و معاشرت کی نشو نما میں اہمیت، مشقت اور عظمت کو اجاگر کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں جوشؔ کسان کی محنت و مشقت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان ہل چلا کر بیجائی سینچائی کر کے زرخیز زمین سے زر کشید کرتا ہے۔ اس کی شبانہ روز محنت سے ایک ہی زمین سے مختلف ذائقوں کو اور تاثیر کا اناج، مختلف اقسام کے پھل اور مختلف رنگ و بو کے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ اگر پودوں، اناج کی بالیوں اور گھاس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو دراصل ان کی رگوں میں انسان کا لہو دوڑ رہا ہوتا ہے اور اناج و پھلوں کے پودوں میں کسان کی محنت کا خون لہر کھاتا دکھائی دیتا ہے۔ پودوں کا تناور ہونا، بارور ہونا، اس کی خون پسینے کی محنت کا ثمر ہے۔ اس کا خونِ جگر رنگ و بو کا سیلاب برپا کر دیتا ہے۔ اس کے دل کی آنچ کھلیانوں میں ہزاروں پودوں کو جنم دیتی ہے جو انواع واقسام کے ذائقوں کے اناج اور پھل پر منتج ہوتے ہیں۔ انواع واقسام کا یہ اناج، یہ پھل اور یہ پھول، بہادر اور محنتی کسان کے خونِ جگر کی نمود ہے۔ دھوپ کی شدت ہو یا رات کی تاریکی، آندھی ہو یا طوفان، بہادر کسان اپنی قلبی طاقتوں کے ساتھ مصروف کار رہتا ہے۔ اس کا پسینہ پودوں کو حیات بخشنے کے لیے بہتا ہے۔ اس کی سوچ کا محور، اس کے خیالوں کا مرکز، اس کی چاہت کا دائرہ اس کی بوئی گئی فصلیں ہوتی ہیں۔ یہ اس کے گرمی خون اور خونِ جگر کا معجزہ ہے کہ خاک کے پردے سے رنگا رنگ فصلیں نمودار ہوتی ہیں اور رنگ و بو کا قافلہ اتر پڑتا ہے۔

بند نمبر 5

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

مفہوم:

رات کو اس کی نظر آسمانوں کی بلندیوں تک جاتی ہے اور دن بھر اس کی انگلیاں نبضِ خاک پر رہتی ہیں۔

تشریح:

جوش ملیح آبادی کا شمار ممتاز نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ رومانوی اور ترقی پسندانہ شاعری ان کی نظموں کا خاص عنصر ہے۔ نظم کسان میں انہوں نے کسان کی تہذیب و معاشرت کی نشو نما میں اہمیت، مشقت اور عظمت کو اجاگر کیا ہے۔

زیر تشریح شعر میں جوش کسان کی محنت و مشقت کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان ہل چلا کر بیجائی، آبیاری اور رکھوالی میں شب و روز گزارتا ہے۔ نینداس کے ارادوں میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ وہ کھیتی باڑی کے کام کے لئے رتجگے گزارتا ہے۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے کاشت کے نئے آسمانوں پر نگاہ رکھتا ہے اور منصوبے بناتا ہے۔ اس کی رات بھی کاشتکاری کے نام اس کا دن بھی کھیتی باڑی کے نام۔ زمین میں ہل چلاتے، پودوں کی نلائی کرتے، بیجائی کرتے، سینچائی کرتے اس کا دن گزرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اب زمین ہل چلانے یا بیجائی کرنے کے لائق ہے یا نہیں۔ زمین میں نمی دیکھے تو ہل چلانے کا کام شروع کر دیتا ہے۔ مٹی کی نبض دیکھ کر اس میں بیجائی کرتا ہے۔ وقت آنے پر پانی دیتا ہے۔ اور فصلوں اور رنگ و بو کے سیلاب کی نمود کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ وہ پہچان رکھتا ہے کہ کس موسم میں زمین کس فصل کو اپنے عناصر سے بہرہ ور کرتی ہے اور پروان چڑھاتی ہے۔ وہ خاک میں محنت سے خاک ہو جاتا ہے اور زندگیوں کو خاک کی خوراک بننے سے بچاتا ہے۔

بند نمبر 6

سر نگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

مفہوم:

اس کی محنت سے خوشحالی و روزگار کا وہ ماحول پیدا ہوتا ہے جس سے تخریب کی قوتیں سرنگوں رہتی ہیں اور اس کے بل بوتے پر تہذیب و تمدن میں جان پڑتی ہے۔

تشریح:

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی ممتاز نظم گو رومانوی اور ترقی پسند شاعر تھے۔ نظم کسان میں انہوں نے کسان کی محنت و مشقت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں جوش دہقان کی عظمت کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان محنتی اور ایثار منش انسان ہے۔ وہ ہل چلانے، بیجائی، سینچائی، گوڑائی اور دیکھ بھال سے وہ اناج پیدا کرتا ہے جس پر انسان اور چرند پرند پلتے ہیں۔ اس کی محنت سے خوراک کی کثرت ہوتی ہے۔ ملک میں بھوک کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ملکی معیشت مضبوط ہوتی ہے۔ یوں وہ منفی اور تخریبی سرگرمیاں جو بھوک اور بدامنی کے سبب ہوتی ہیں، ان کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ جب معیشت مضبوط ہو، خوشحالی ہو تو امن و امان کے ذمہ دار اداروں کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور ماحول اچھا ہوتا ہے۔ یوں تخریبی قوتیں، چوری ڈاکے، بد نظمی کی طاقتیں جھکی رہتی ہیں۔ اسی کی بدولت رسم و رواج اور رہن سہن میں ترقی شائستگی، رنگارنگی پیدا ہوتی ہے۔ بیساکھی، ڈھول کی تھاپ پر کٹائی، برسات میں دھان کی فصل کی اجتماعی بیجائی باقاعدہ رسم ہے اور شادی بیاہ کی رسمیں اناج اور معاشی حالت بہتر ہونے پر منعقد ہوتی ہے۔ یوں کسان کی خون پسینے کی محنت کے بل بوتے پر تہذیب نمو پاتی ہے۔

بند نمبر 7

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

مفہوم:

زمین سے خوبصورت اور نازک پودوں کے ظہور کا انحصار کسان کے بازوؤں کی مضبوطی میں ہے۔ اس کی بدولت وہ خوشحالی آتی ہے جس کی وجہ سے بادشاہ کی ریاست اور تخت میں پائیداری آتی ہے۔

تشریح:

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی ممتاز نظم گو رومانوی اور ترقی پسند شاعر تھے۔ نظم کسان میں انہوں نے کسان کی محنت و مشقت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں جوش کسان کی محنت کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان کی خون پسینے کی محنت زمین سے رنگ و بو کا سیلاب نمودار کرتی ہے۔ انسان اور چرند پرند اس کی محنت پر نشو نما پاتے ہیں۔ وہ محنتی اور بہادر ہے اس کے بازو ہل چلا کر زمین کو نرم کرتے ہیں تاکہ بیجائی کے قابل ہو۔ یہ مٹی نرم ہوتی ہے تو نرم و نازک کونپلیں اس سے نمودار ہوتی ہیں، بالیوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ رنگ و بو اور اناج کا منبع پودوں کی نرم و نازک فصلیں اسی کی محنت کا ثمر ہیں۔ زمین کی زرخیزی سے یہ زر کسان ہی کشید کرتا ہے۔ نرم و ملائم پتے، کونپلیں، پھول اس کی بازو کی قوّت سے جنم لیتے ہیں۔ کسان کے دم خم پر بادشاہ کے غرور اور فخر کا انحصار ہے۔ بادشاہ کی ریاست کی خوراک کا مدار کسان کی مشقت پر ہے۔ اگر ریاست میں بھوک اور قحط ہو تو بادشاہ کے تخت و تاج عوامی احتجاج کے زلزلے کا شکار ہوتے ہیں۔ بدامنی، لاقانونیت، چوری ڈاکے اور بے چینی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اگر کسان کھیتوں میں پسینوں میں ڈھل کر اناج کو وافر کر دیں تو اسی ریاست میں خوشحالی اور امن ہوتا ہے۔ معاشرتی خوشحالی سے ثقافتی سرگرمیاں نمو پاتی ہیں۔ خوشحالی سے جرائم اور متشدد رویوں کی بجائے نرم رویے رواج پذیر ہوتے ہیں۔ بادشاہ کا تخت محفوظ ہوتا ہے اور اسے فخر ہوتا ہے کہ اس کی ریاست میں کوئی بھوکا نہیں سوتا اور روٹی کی فراوانی ہے۔ بادشاہ کا اعتماد فخر میں بدل جاتا ہے۔ بادشاہ کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور مشکل وقت میں عوام اس کی پیٹھ پر ہوتے ہیں۔ اس کے لئے لڑتے مرتے ہیں۔ یوں بادشاہ کے غرور کا دار و مدار کسان کی محنت پر ہے۔

میرے دہقاں یونہی ہل چلاتے رہیں
میری مٹی کو سونا بناتے رہیں

بند نمبر 8

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ، گھر کی جانب ہے رواں

مفہوم:

کسان دن بھر جانکاہ مشقت میں مصروف رہا۔ اس کا چہرہ دھوپ میں کام کرنے کے سبب جھلسا ہوا ہے۔ اب جب شام ہو گئی اب اس نے کام کاج چھوڑا ہے اور گھر کی طرف روانہ ہوا ہے۔

تشریح:

شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی ممتاز نظم گو رومانوی اور ترقی پسند شاعر تھے۔ نظم کسان میں انہوں نے کسان کی محنت و مشقت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں جوشؔ دہقاں کی محنت اور عظمت کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان کی محنت کے بل بوتے پر انسان، چرند پرند کی نشوو نما ہوتی ہے۔ انہیں خوراک ملتی ہے وہ دن بھر فصلوں کی پرورش، پرداخت میں مصروف عمل ہوتا ہے۔ وہ ہل چلاتا ہے۔ بیجائی، سینچائی، گوڑائی اور رکھوالی کے عمل کے دوران اپنا پسینہ بہاتا ہے اور زمین کی زرخیزی سے زر کشید کرتا ہے اور رنگ و بو کا سیلاب نمودار کرتا ہے۔ وہ کڑی دھوپ اور شدید موسموں کا مقابلہ کر کے وہ اناج پیدا کرتا ہے جس پر جہان پلتا ہے۔ اسی لئے اسے جگ کا پالن ہار کہتے ہیں۔ شام کے اس جھٹ پٹے میں کسان کے چہرے پر دن بھر کی محنت اور مشقت کے نشان ہیں اور دن بھر کے کام کے بعد اب جا کر شام کے دُھندلکے میں اس نے کھیت سے منہ موڑا ہے اور گھر کی طرف رواں دواں ہے۔ جوشؔ نے کسان کی محنت کو خراج تحسین پیش کیا ہے جس کی بدولت دیہات آباد ہوتے ہیں، لوگوں کو خوراک ملتی ہے اور ملکی معیشت ترقی کرتی ہے۔ امن وامان اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ تخریبی طاقتوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ کاشتکاری ایک مشکل عمل ہے جس کی چکی میں پسنے والے کسان اپنے ایثار اور انتھک محنت سے اپنے فرض کو پورا کرتا ہے۔ وہ دھوپ میں جل جائے، سرد موسموں میں ٹھٹھر جائے، طوفانوں کو ننگے سر برداشت کرے، تیز بارشوں میں نہانا پڑے کبھی گھبراتا اور ہارتا نہیں۔ اس کا مقام بہت بلند ہے۔ جوشؔ نے نظم کا اختتام تاثرات سے پر اثر بنادیا ہے کہ دن بھر میں چہرے کو جھلسا کر کڑی دھوپ جھیل کر محنت کرنے والا کسان اب شام کے اندھیرے میں جب کام کرنا ممکن نہیں رہا تب گھر کی طرف رواں ہے کہ دو گھڑی آرام کر کے پھر علی الصبح اسی روزمرہ کی جانکاہ مشقت کو جاسکے۔ جس کے بل بوتے پر انسان چرند پرند پلتے ہیں اور وطن کی معیشت مضبوط ہوتی ہے۔

18 ۔ جیوے جیوے پاکستان

(جمیل الدین عالیؔ)

بند نمبر 1

مہکی مہکی روشن روشن پیاری پیاری نیاری
رنگ برنگے پھولوں سے اک سجی ہوئی پھلواری
پاکستان پاکستان-------جیوے پاکستان

مفہوم:

پاکستان رنگ برنگے پھولوں کی سجی ہوئی پھلواری ہے اس پھلواری کے سب پھول نکھرے نکھرے مہکے مہکے پیارے پیارے اور نرالے ہیں۔ ہم سب پاکستانی ہیں۔ خدا کرے یہ ملک ہمیشہ سلامت رہے۔

تشریح:

جیوے جیوے پاکستان، جمیل الدین عالیؔ کا لکھا ہوا ملی نغمہ ہے۔ پاکستان کے مختلف لوگوں کو رنگ برنگے پھولوں سے تشبیہ دی گئی ہے ہر پھول اپنی رنگت اور نکھار سے الگ پہچان رکھتا ہے اور اس پھولوں کی کیاری کا حصہ بھی ہے۔ پاکستان ایک خوبصورت ملک ہے اللہ تعالیٰ اسے قائم دائم رکھے اور اس کی صبحیں روشن ہیں اس کی شامیں رنگین ہیں مجھے اپنے وطن کا ذرہ ذرہ جان سے پیارا ہے۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ پاکستان ایک مہکتا اور کھلتا ہوا روشن باغ ہے پھولوں کی یہ مہک اور تازگی ہمارے دل و دماغ کو سکون بخشتی ہے۔ پھولوں کی رنگینی ہمارے ذوق و شوق کو ظاہر کرتی ہے ہم مایوس قوم نہیں بلکہ پُر امید اور مصمم ارادہ رکھنے والے لوگ ہیں۔ خدا کرے پاکستان زندہ رہے سدا آباد رہے۔

سوہنی دھرتی اللہ رکھے
قدم قدم آباد تجھے
قدم قدم آباد تجھے
جب تک ہے یہ دنیا باقی ہم دیکھیں آزاد تجھے
ہم دیکھیں آزاد تجھے

بند نمبر 2

من پنچھی جب پنکھ ہلائے کیا کیا سُر بکھرائے

سُننے والے سنیں تو ان میں ایک ہی دُھن لہرائے

پاکستان پاکستان-------جیوے پاکستان

مفہوم:

دل کی آواز ایسے ایسے سریلے نغمے بکھیرتی ہے کہ سننے والوں کے دلوں میں ایک ہی دھن لہرائے لگتی ہے۔ جیوے جیوے پاکستان۔

تشریح:

شاعر جمیل الدین عالیؔ نے اس بند میں پاکستان کے ساتھ پیار کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم اس وطن کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ وطن کی محبت میں انسان کا دل بلند و بالا خیالات میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ فضاؤں میں وطن کی محبت کے نغمے گونجنے لگتے ہیں۔ ہمارا ہر نغمہ اپنے وطن کے لئے ہوتا ہے۔

وطن کی محبت میں گیت گاتے ہوئے صرف شاعر ہی نہیں سننے والے بھی ان سریلے نغموں میں مدہوش ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے وطن کے لیے ہیں اور وطن ہمارے لئے ہے۔ ہمارے ہونٹوں پر جب بھی کسی کا ذکر آئے تو اے وطن! وہ تیرے لئے ہی ہوتا ہے۔ اے وطن! تیری سلامتی کی دعا ہر ایک لب پر ہے۔ سب ایک ہی دھن میں مست ملی نغمے گاتے ہیں۔ اپنے وطن سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اے خدا! میرا پیارا وطن سدا قائم رہے۔ ہم اس کی عظمت اور خوشحالی کے ترانے گاتے رہیں۔

جُگ جُگ جیے میرا پیارا وطن

لب پہ دعا ہے دل میں لگن

اے وطن تو ہمیشہ ہمیشہ رہے

تیری عظمت کا جھنڈا اٹھائیں گے ہم

تیری تقدیس کے گیت گائیں گے ہم

تیری خاطر دل وجاں لٹائیں گے ہم

اے وطن تو ہمیشہ ہمیشہ رہے

بند نمبر 3

بچھڑے ہوؤں کو بکھرے ہوؤں کو اک مرکز پر لایا

کتنے ستاروں کے جُھرمٹ میں سورج بن کر آیا

پاکستان پاکستان--------جیوے پاکستان

مفہوم:

بکھرے اور بچھڑے ہوئے لوگ پاکستان میں اکٹھے ہو گئے اور پاکستان ایک سورج کے طور پر دنیا میں اُبھرا۔ اے خُدا! پاکستان ہمیشہ جیے اور سلامت رہے۔

تشریح:

پاکستان بننے سے پہلے لوگ نظریاتی، فکری اور سیاسی اعتبار سے بکھرے اور بچھڑے ہوئے تھے۔ مسلمان انگریزوں کے غلام تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی اُن پر قابض تھے۔ مسلمانوں کو من حیث القوم ختم کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کردیے گئے تھے۔ سکولوں میں اسلام کے خلاف تعلیم دی جاتی تھی۔

مسلمانوں کی جائیدادیں ہتھیالی گئی تھیں۔ مسلمان پریشان حال تھے، ایسے وقت میں انہیں راہنما کی ضرورت تھی۔ جو انہیں ایک مرکز پر اکٹھا کردے۔ قائدِاعظم محمد علی جناح نے تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا اور پاکستان حاصل کیا۔

شاعر کہتا ہے کہ یہ پاکستان ہی تھا جس نے بچھڑے ہوؤں کو ایک جگہ جمع کیا۔ پاکستان ایک سورج کی مانند ہے، اس کی کرنیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، پاکستان اپنی روشنی سے سارے عالم کو منور کررہا ہے۔ تمام مسلمان آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں اے خدا! پاکستان کے تمام لوگ متحد رہیں اور یہ ستاروں کے ساتھ سورج کی طرح چمکتا رہے۔ پاکستان میرا دیس ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قائم دائم رکھے۔

اے وطن تو ہمیشہ ہمیشہ رہے

تو بسے، تو بڑھے، تو پھلے اے وطن

بند نمبر 4

سب محنت کش گلے ملے اور اُبھرا اک پیغام

اس پیغام کو سمجھو یہ ہے قدرت کا انعام

پاکستان پاکستان --------جیوے پاکستان

مفہوم:

پاکستان میں سب محنت کرنے والے ایک دوسرے سے گلے ملے۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور ایک پیغام واضح ہوتا گیا کہ یہ ملک پاکستان ہم سب کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔ پاکستان جیوے پاکستان۔

تشریح:

ہم سب ایک ہیں، ہم سب پاکستانی ہیں، ہم سب کی محنت پاکستان کے لیے ہے۔ ہم سب متحد ہیں پاکستان ہمارا دیس ہے اسے ہزاروں قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے ایک انعام ہے۔ یہ محنت کشوں کا دیس ہے حدیث پاک ہے۔

"محنت سے روزی کمانے والا اللہ کا دوست ہے"۔

مسلمان اس حدیث کی روشنی میں اپنی زندگی گزارتے ہیں اور رزق حلال کماتے ہیں۔ ہمارے کسان شب و روز کھیتوں میں مصروف رہتے ہیں اور پورے پاکستان کے لیے اناج تیار کرتے ہیں۔ ہمارے مزدور اس دور کے کوہ کن ہیں۔

ہر طرف ایک ہی پیغام ہے کہ تمام دیس ہمارا ہے ہم ضرورت پڑنے پر پاکستان کے لیے جان بھی قربان کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دیس ہمیں لاکھوں قربانیوں کے بعد عطا کیا ہے۔ اب اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ محنت اور خلوصِ نیت سے اقوامِ عالم میں پاکستان کا نام بلند کرنا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ ہمیں مختلف سماجی، فکری اور سیاسی اختلافات بھلا کر ایک ہو جانا چاہیے اسی میں ہماری بقا و سلامتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو قائم رکھے۔ تمام لوگ بھائی بھائی بن جائیں ملک کے کسی گوشے میں کسی نسل کا بندہ ہو۔ وہ ہمارا بھائی ہے ہم سب آپس میں محبت اور اتفاق سے رہتے ہیں۔

اے وطن تو ہمیشہ ہمیشہ رہے
تیرے فرزند دھرتی کے دمساز ہیں
تیرے مزدور محنت کے ہم راز ہیں
تیرے پیر و جواں باعثِ ناز ہیں
اے وطن تو ہمیشہ ہمیشہ رہے

بند نمبر 5

جھیل گئے دکھ جھیلنے والے، اب ہے کام ہمارا
ایک رہیں گے، ایک رہے گا، ایک ہی نام ہمارا
پاکستان پاکستان---------جیوے پاکستان

مفہوم:

پاکستان بہت قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ پاکستان بنانے والوں نے بہت سی مصیبتیں جھیلیں۔ اب یہ کام ہمارا ہے کہ ہم اسے بلند مقام پر رکھیں۔

تشریح:

حصولِ پاکستان کے لیے مسلمانوں نے بہت سی قربانیاں دیں۔ پاکستان حاصل کرنا کسی خواب سے کم نہ تھا۔ اس کا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا اور اس کی تعبیر قائدِاعظم نے پوری کی۔ وہ تمام مشکلات کے باوجود اپنا کام کر گئے اور ایک خوبصورت اور آزاد وطن ہمارے حوالے کر دیا۔ پاکستان کا قیام ہمارے بزرگوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ماؤں نے اپنے بیٹوں کو قربان کیا۔ عورتوں نے اپنا سہاگ لٹایا۔ بہنوں نے اپنے بھائیوں کو کھویا۔ ہزاروں لوگ یتیم ہوئے۔ لاکھوں بے گھر ہوئے۔ مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگ بیمار ہو گئے۔ بچوں نے بھوک سے نڈھال ہو کر اپنی جان دے دی۔

الغرض دکھ جھیلنے والے اپنے حصے کے دکھ جھیل گئے ہیں۔ اب ہماری باری ہے۔ اب ہم نے اپنے ملک اور قوم کے لیے کچھ کرنا ہے۔ یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ پاکستان کی حفاظت کریں۔ اس پر آنچ نہ آنے دیں۔ اس کو سنواریں۔ اقوامِ عالم میں اس کا نام روشن کرنے کے لیے دن رات محنت کریں۔ اسے خوبصورت اور ترقی یافتہ بنائیں۔ آؤ ہم سب عہد کریں کہ ہم سب متحد رہیں گے۔ پاکستان کے سب لوگ جسمِ واحد بن کر رہیں گے اور ہمارا نام ایک رہے گا۔

19 ۔ اونٹ کی شادی

دلاور فگار

بند نمبر1

نیا یہ آج کے پرچے نے گل کھلایا ہے
کہ سہرا باندھ کے اک اونٹ بلبلایا ہے

مفہوم:

آج کے اخبار نے یہ نیا گل کھلایا ہے کہ ایک اونٹ نے شادی کے لئے سہرا باندھا اور بلبلایا۔

تشریح:

دلاور فگار کا شمار مشہور مزاحیہ شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ واقعاتی اور طنزیہ مزاح نگاری سے لطیف نکتہ پیدا کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں دلاور فگار اونٹ کی شادی کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے اخبار میں انوکھی اور مضحک خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک اونٹ کو شادی کا سہرا باندھا گیا وہ شادی کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ سہرا باندھ کے اونٹ بلبلایا ہے۔ شادی دو افراد کے درمیان ازدواجی اور شرعی بندھن ہے اور اس اہم بندھن کو باندھنے کی کچھ رسمیں ہیں جن میں سے ایک معروف رسم سہرا باندھنا ہے۔ کچھ لوگ ازراہِ تفنن اپنے پیارے پالتو جانوروں کی شادی کی رسم بھی منعقد کر لیتے ہیں۔ آج کے اخبار کے تازہ شمارے میں بھی ایسی ہی نرالی گل فشانی کی گئی ہے۔ کہ ایک اونٹ سہرا باندھ کے بلبلا اٹھا۔ گویا اسے اس پُر مسرت موقع کی نزاکت و اہمیت کا احساس تھا۔ شاعر نے لفظ بلبلانا سے بعد از شادی کی، بِلبلاہٹ مراد لی ہے۔ عام طور پر مرد شادی کے بعد بلبلاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ شادی کے بعد کی ذمہ داریوں اور بیوی کی ناز برداریوں سے بلبلا اٹھتے ہیں۔ نان نفقے کی ذمہ داری، بچوں کے مختلف اخراجات کا بندوبست، بیوی کے ناز نخرے اور تابع فرمانی اچھے اچھے مردوں کا پِتا پانی کر دیتی ہے۔ اور وہ بلبلا اٹھتے ہیں۔ آج کے اخبار میں یہ نیا گل کھلایا گیا ہے کہ ایک اونٹ سہرا باندھنے کے بعد بلبلا اٹھا۔ دلاور فگار نے اونٹ کو سہرا باندھے دیکھ کر مردوں کی شادی کے بعد کی کیفیت کو بطور تمثیل مراد لیتے ہوئے مزاح پیدا کیا ہے کہ میاں سہرا باندھ کر ذمہ داری تو اٹھا لی اب زندگی بھر پچھتاؤ گے اور یہ کہتے ہوئے پائے جاؤ گے۔

کدی تے پیکے جانی بیگم
آوے سکھ دا ساہ نی بیگم

ایک کہاوت ہے کہ اونٹ بلبلاتا ہی لدتا ہے۔ اب سہرا باندھ کر اونٹ اپنے اوپر ذمہ داریوں کے بوجھ کا سوچ کر بلبلا اٹھا ہے۔ اب ساری زندگی بڑبڑائے گا۔

بند نمبر2

شتر کے گھر میں پیام بہار ہے سہرا
کبھی کبھی تو بڑا بے مہار ہے سہرا

مفہوم:

شادی کا سہرا اونٹ کے گھر میں نئی بہار کا پیغام ہے، لیکن یہ سہرا کبھی کبھی بے مہار ثابت ہوتا ہے۔

تشریح:

دلاور فگار مشہور مزاحیہ نظم گو شاعر تھے۔ان کا مزاحیہ کلام واقعاتی اور طنزیہ مزاح نگاری پر مبنی ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں دلاور فگار اونٹ کی شادی کو موضوعِ سخن بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اونٹ کی سہرا بندی اگرچہ ایک مضحک بات ہے جس کی اخبار میں تصویر شائع ہوئی ہے۔ لیکن سہرا بندی تو خوشی کا موقع ہے۔ یہ شادی کی اہم رسم ہے۔اب جب اونٹ کو سہرا باندھا گیا ہے تو یہ اس کے گھر میں موسم بہار کا پیغام ہے۔ دل کی غمی کو خزاں اور دل کی خوشی کو بہار کے موسم سے تشبیہ دی جاتی ہے۔اونٹ کا دل تو خوش ہے ہی کہ اس کے گھر میں بھی رونق اور چہل پہل ہو گی۔ شادی کے بندھن کی محبت کی خوشی بھی ہو گی اور بیوی بچوں سے رونق بھی۔اونٹ کی نسل آگے بڑھے گی۔ کبھی کبھی یہ سہرا شترِ بے مہار کا کام کرتا ہے۔اب ایسا ہے کہ شتر کے لیے اگر سہرا بے مہار ثابت ہوا تو "شترِ بے مہار" کی مثل صادق آئے گی۔ شترِ بے مہار کے کنایہ سے بے لگام اور بے قابو زندگی اور مزاح مراد لیا جاتا ہے۔ سہرا ابھی کبھی کبھی بے مہار ہو جاتا ہے۔اب دیکھیں تو یہ انسانوں کے سر سے بے لگام ہو کر اونٹ کے سر پر جا پہنچا۔اسے مردوں کی شادی کے دن کی علامت سمجھا جاتا تھا اب اونٹ جیسے جانور کی شادی کے دن کی رسمی علامت بھی بن گیا۔شتر کے معاملے میں سہرا شترِ بے مہار ہو گیا۔

بند نمبر 3

میرے بنّے کو مبارک یہ خوشگوار گھڑی
کہ سر کا درد بڑھا ناک میں نکیل پڑی

مفہوم:

میرے دولہے کو یہ خوشگوار لمحات مبارک ہوں۔اب شادی کے بعد سر کا درد بڑھ جائے گا اور آزادی ختم ہو جائے گی۔

تشریح:

دلاور فگار کا شمار مشہور مزاح نگار شعرا میں ہوتا ہے۔وہ واقعاتی اور طنزیہ مزاح نگاری سے لطیف نکتہ پیدا کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں دلاور فگار اونٹ کی شادی کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے اخبار میں اونٹ کی سہرا بندی کی تصویر چھپی ہے۔اونٹ سہرا باندھ کے بلبلایا ہے۔ میرے بنّے کو یہ خوشگوار لمحات مبارک ہوں۔ شادی خانہ آبادی ہوتی ہے۔اونٹ کی خوشی حقیقی ہے کہ گھر میں رونق اور چہل پہل ہو گی۔ شادی کے بندھن کی خوشی اس کے چہرے پر عیاں ہے لیکن اس خوشی میں اس کے لیے فکر مندی کا سامان بھی موجود ہے۔ ابھی تو خوشی ہے لیکن بعد میں جب ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا تو وقت بے وقت کا دردِ سر ہو گا۔ بے مہار زندگی ختم ہو جائے گی۔ اور ذمہ داریوں کی نکیل پڑ جائے گی۔ شاعر نے انسانی شادی کے بعد کے اثرات کو مراد لیا ہے۔ شادی کی تقریبات کا تو بہت جوش و خروش سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں گھریلو ذمہ داریاں، بیوی کی ناز برداری ناک میں نکیل ڈال کر ناک میں دم کر دیتی ہے۔ جینا محال ہو جاتا ہے۔اب اونٹ

سہرا بندی پر تو خوش ہے لیکن بعد کی سر دردی سے ناواقف ہے۔اب سر کا درد بڑھے گا اور طرح طرح کی ذمہ داریوں کی نکیل پڑ جائے گی۔آزادی کا دور اب ختم ہوا اور قید دوام کا آغاز ہو گیا۔

بند نمبر 4

سمجھ لیا تھا جسے جانور سواری کا

وہ اونٹ بوجھ اٹھائے گا ذمہ داری کا

مفہوم:

ہم اونٹ کو محض سواری کا جانور سمجھتے تھے۔اب پتہ چلا یہ جانور ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھائے گا۔

تشریح:

دلاور فگار کا شمار مشہور مزاح نگار شعرا میں ہوتا ہے۔وہ واقعاتی اور طنزیہ مزاح نگاری سے لطیف نکتہ پیدا کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں دلاور فگار اونٹ کی شادی کے منفرد واقعہ کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے اخبار میں اونٹ کی شادی کی خبر شائع ہوئی ہے۔انسانوں کی سہرا بندی تو معمول کی رسم ہے لیکن اونٹ کی سہرا بندی انوکھا واقعہ ہے۔ہم تو سمجھتے تھے کہ اونٹ سواری کا جانور ہے۔اونٹ صحرائی جہاز کہلاتا ہے۔اس پر صدیوں سے انسان سفر کرتا آیا ہے۔اسے اونٹ گاڑی میں بھی جوتا جاتا ہے۔انسانی بوجھ اور ساز و سامان کا بوجھ اٹھانا تو اونٹ کے لیے روایتی اور قدرتی عمل ہے لیکن آج جس اونٹ کی شادی کی تصویر چھپی ہے یہ اونٹ انسانی اور ساز و سامان کا بوجھ اٹھانے کے بجائے ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گا۔شادی خانہ آبادی بھی ہے اور نکیل بندی بھی۔گھر کی مختلف ذمہ داریاں اٹھانا پڑتی ہیں۔نان نفقے کے علاوہ بیوی بچوں کے ناز نخرے بھی برداشت کرنا ہوتے ہیں۔انسانی معاشرتی زندگی میں شادی سے پہلے اور بعد کی زندگی کو شاعر نے مراد لیتے ہوئے اونٹ پر محمول کیا ہے کہ اب اس کا مستقبل طرح طرح کی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہو گا۔شاعر نے لطیف نکتہ پیدا کیا ہے کہ ہم تو سمجھتے تھے اونٹ محض سامان کا بوجھ اٹھاتا ہے، یہ اونٹ شادی کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گا۔یہ واقعی ایک اچھوتی بات ہے کہ اونٹ اب ازدواجی ذمہ داریاں اٹھائے گا۔

مشہور کہاوت ہے کہ "اونٹ کی پکڑ اور عورت کے مکر سے خدا بچائے" لیکن اب اونٹ جب خود ذمہ داریوں کی پکڑ میں آئے گا تو شادی کی پکڑ کا پتہ چلے گا۔!

بند نمبر 5

میاں شتر کو مبارک یہ رشتہ شادی

اسی کو کہتے ہیں اردو میں قیدِ آزادی

مفہوم:

اونٹ جو اب میاں بن چکے،ان کو شادی کا رشتہ مبارک ہو لیکن میاں اونٹ! اردو میں شادی کو قیدِ آزادی کہتے ہیں۔

تشریح:

دلاور فگار کا شمار مشہور مزاح نگار شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ واقعاتی اور طنزیہ مزاح نگاری سے لطیف نکتہ پیدا کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں دلاور فگار اونٹ کی شادی کی انوکھے واقعے کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ اخبار میں ایک اونٹ کی سہرا باندھ کر بلبلانے کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ شاعر نے اونٹ کی شادی کو مرد کی شادی کے بعد کے اثرات پر محمول کیا ہے کہ میاں اونٹ ابھی تو شادی کی خوشی سے باغ باغ ہیں۔ ان کو شادی خانہ آبادی کا یہ رشتہ بہت مبارک ہو۔ خدا کرے ان کو بعد از شادی خوشیاں ملیں اور اس تعلق کے قائم ہونے سے ان کے لئے مبارک لمحات آئیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ شادی ان کے لیے قیدِ آزادی ثابت ہوگی۔ اب ذمہ داریوں کا بوجھ ہوگا۔ آزادی محدود ہو جائے گی۔ اگرچہ تنگی قفس تو نہیں لیکن قیدِ آزادی ضرور ہوگی۔ عام طور پر مرد شادی کے بعد بہت سی آزادیاں سلب کروالیتا ہے۔ خانہ آبادی کے نام پہ بہت سی کڑی ذمہ داریاں اور پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ ادیب حضرات اسے قیدِ آزادی سے موسوم کرتے ہیں۔ دلاور فگار نے اسی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ سہرا باندھ کے اب اونٹ قیدِ آزادی میں چلا گیا ہے۔

بند نمبر 6

میاں شتر نئی گاڑی لیے سفر کو چلے
مجھے خوشی ہے کہ تم آگئے پہاڑ تلے

مفہوم:

میاں اونٹ اب زندگی کی نئی گاڑی لے کر سفر پر روانہ ہوئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔

تشریح:

دلاور فگار مشہور مزاح نگار شاعر تھے۔ ان کا شگفتہ کلام واقعاتی اور طنزیہ مزاح نگاری پر مبنی ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں دلاور فگار اونٹ کی شادی کے انوکھے واقعے کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے اخبار میں اونٹ کی شادی کی نرالی تصویر شائع ہوئی ہے۔ میاں اونٹ کی زندگی کی نئی گاڑی کے سفر کا آغاز ہوا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے اپنے سے اونچا کسی کو نہیں جانتا، اب شادی کے بعد کی ذمہ داریوں کے پہاڑ کے نیچے آکر اسے اپنی نئی حقیقت پتا چلے گی۔ بعد از شادی کی ذمہ داریاں، ہمسفر کی ناز برداریاں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلادیں گی۔ اونٹ گاڑی تو مشہور ہے بار برداری کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نئی چیز ملے تو خوش ہوتی ہے۔ اب تو میاں اونٹ کو ازدواجی زندگی کی نئی گاڑی ملی ہے۔ اب خوشی دوچند ہوگی۔ اس سفر پر میاں اونٹ عازم سفر تو ہوئے ہیں لیکن اب اونٹ کو اپنا قد کاٹھ معلوم ہوگا۔ یوں سمجھیں میاں اونٹ کہ اب آپ پہاڑ تلے آگئے کیونکہ اپنے سے زبردست ہونے کا مقابلہ ہونے پر ہی اپنی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اب شادی کی ذمہ داریوں کا پہاڑ اٹھاؤ گے تو اپنی حقیقت کا پتہ چلے گا۔ شاعر نے ازدواجی کڑی ذمہ داریوں کو پہاڑ سے تشبیہ دے کر اونٹ کا پہاڑ کے نیچے آنا کی کہاوت کے ساتھ منسلک کر کے شگفتہ معانی پیدا کیے ہیں۔ شادی کے بعد مرد جن کڑی ذمہ داریوں اور پابندیوں کے بندھن میں بندھ جاتا ہے اس پر محمول کرتے ہوئے اونٹ کو خبردار کیا گیا ہے کہ آپ بہت بڑے قد و قامت کے ضرور ہیں لیکن اب آپ اس پہاڑ کے نیچے آگئے تو اپنی نئی اصلیت کا مزا چکھو گے۔

بند نمبر 7:

مجھے بیاہ کی تصویر بھیج دیں جھٹ پٹ

یہ دیکھنا ہے کہ بیٹھے ہیں آپ کس کروٹ

مفہوم:

میاں اونٹ مجھے شادی کی تصویر فوراً بھیج دیں۔ مجھے دیکھنا ہے کہ آپ کس کروٹ بیٹھے اور شادی کے معاملے کا انجام کیا ہوا۔

تشریح:

دلاور فگار کا شمار مشہور مزاح نگار شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ واقعاتی اور طنزیہ مزاح نگاری سے لطیف نکتہ پیدا کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں دلاور فگار نے اونٹ کی شادی کو موضوعِ سخن بنایا ہے کہ اخبار میں اونٹ کی سہرا بندی کی تصویر شائع ہوئی ہے جو شادی کا بندھن اٹھاتے ہوئے بلبلایا ہے۔ شادی خوبصورت بندھن ہے لیکن بعد از شادی کی کڑی ذمہ داریاں بہت سے پہرے لگا دیتی ہیں اور آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ میاں اونٹ بھی بعد از شادی کی اس صورت حال کے کڑوے گھونٹ پیئیں گے۔ شاعر کہتا ہے کہ میاں اونٹ آپ مجھے اپنی شادی کی تصویر جلد از جلد بھیج دیں تاکہ پتہ چلے کہ آپ کس کروٹ بیٹھے ہیں۔ مشہور کہاوت ہے کہ اونٹ دیکھئے کس کروٹ بیٹھتا ہے یعنی دیکھیں معاملے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ شاعر کہتا ہے مجھے بھی دیکھنا ہے آپ کی شادی کا کیا نتیجہ نکلا۔ انسانی زندگی میں تو مرد حضرات آہ و فغاں کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ شادی کا پھل کھا کے پچھتا رہے ہیں اور ذمہ داریوں نے کمر ٹیڑھی کر دی ہے۔ اپنی خوشی سے آنے، جانے، کھانے اور رہنے کی آزادیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ آپ پہاڑ کے نیچے آ کر کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ کہیں آپ کو زبردستی تو اس بندھن میں نہیں باندھ دیا گیا اور آپ کے ساتھ "اونٹ لدے بے گاری" کا معاملہ تو نہیں ہو گیا کہ آپ کے بارے میں تو مشہور تھا کہ "اونٹ فرشتے کی ذات ہے"۔

بہر حال آپ کی سہرا بندی کی خبر سے یہ بات تو صادق ہو گی "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی"۔

20 ۔ مال گودام روڈ

مرزا محمود سرحدی

بند نمبر 1

یوں تو میرے شہر میں سڑکیں کئی ہیں لازوال
لیکن ایک ایسی سڑک بھی ہے نہیں جس کی مثال

مفہوم:

یوں تو پشاور میں کئی لازوال سڑکیں ہیں لیکن مال گودام روڈ ایسی سڑک ہے جو بے مثال ہے۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

تشریح طلب شعر میں مرزا محمود سرحدی مال گودام روڈ پشاور کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یوں تو میرے شہر پشاور کی متعدد سڑکوں کی حالت نہایت خراب ہے لیکن ایک ایسی سڑک بھی ہے جس کی خرابی کی کوئی اور مثال نہیں دی جاسکتی۔ سڑکیں رابطے، نقل و حرکت، ترسیلِ سامان اور منزلِ مقصود کی طرف جانے کا راستہ اور ذریعہ ہوتی ہیں۔ ان کی حالت درست ہو تو سفر اور ترسیل سہل اور آسان ہوتی ہے۔ اور اگر حالت خراب ہو تو بشر و سامان دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ سڑکیں روابط کا ذریعہ ہیں ان کی خرابی روابط میں رکاوٹ بنتی ہے۔ چنانچہ شاعر شہر کی بنیادی، مشہور اور مصروف سڑک کی خرابی پر دل گرفتہ ہے۔ مال گودام روڈ پشاور کی مشہور شاہراہ ہے لیکن اس پر جا بجا گڑھے پڑ چکے ہیں۔ خشکی میں یہاں موٹر گاڑیاں ڈگمگاتی ہیں اور بارش میں یہاں کشتیاں چل سکتی ہیں۔ کھڈے، کھائیاں اور گڑھے جابجا موجود ہیں اور سواری کا سواری سمیت کسی وقت بھی تختہ الٹ سکتا ہے۔ حکومت انہی سواریوں سے بہت سے محصول وصول کرتی ہے لیکن نہ جانے اس محصول کا استعمال کہاں ہوتا ہے۔ سڑک پہ تو نظر نہیں آتا۔ شاعر سنجیدہ ہو یا مزاحیہ، معاشرے کا ذہن ہوتا ہے، نقائص اجاگر کر کے اصلاح کا طالب ہوتا ہے۔ مرزا محمود سرحدی بھی متعلقہ محکموں اور حکومت سے سڑک کی تعمیر نو کے طلبگار ہیں۔

میرے دیس کی راہیں، آئیں جب چاہیں
یہاں ٹوٹتی ہیں ٹانگیں پھر ٹوٹتی ہیں باہیں

غور طلب پہلو یہ ہے کہ اس سڑک کی خستہ حالی سے اس کے نگران کار محکموں کی انتظامی خستہ حالی صاف عیاں ہے۔ محکمہ ہائی وے اور سی ڈبلیو ڈی نے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کوتاہی برتی ہے۔ اگر وہ بیدار اور نیک نیّت ہوتے تو یہ سڑک شاندار ہوتی۔

بند نمبر 2

اس کی چھاتی پر کئی ٹانگے الٹ کر رہ گئے

سیکڑوں گھوڑوں کا اس پر ہو چکا ہے انتقال

مفہوم:

مال گودام روڈ کی چھاتی پر کئی ٹانگے الٹ چکے اور سیکڑوں گھوڑے انتقال کر چکے۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنزومزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے طنزومزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں مرزا محمود سرحدی مال گودام روڈ پشاور کی بدحالی کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ مال گودام روڈ شہر کی مرکزی شاہراہ ہے جو شہر میں تجارتی ترسیل سامان اور عوامی نقل و حرکت کا بنیادی ذریعہ ہے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اس پر جا بجا گڑھے اور کھڈے ہیں۔ کتنے ہی ٹانگے اس پر الٹ چکے ہیں اور گھوڑے جیسا جانور جو غیر ہموار سطح پر بھی دوڑ سکتا ہے، گڑھے پھلانگ سکتا ہے، اس سڑک پر مصیبت میں ہوتا ہے اور سیکڑوں گھوڑوں کا اس سڑک پر انتقال ہو چکا ہے۔

سڑک تو آسانی سے سفر کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔شاہراہ تو عام عوام کے سفر کو آسان بناتی ہے اور اس پر چلنے والی ٹریفک ملکی معاشی جسم کی رگ ہوتی ہے۔مال گودام روڈ جیسی سڑک شہر کی شہ رگ ہوتی ہے۔اگر شہ رگ کا یہ حال ہے تو شہر میں سفر اور ترسیلِ سامان کی کیا حالت ہو گی، بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شاعر نے مزاحیہ انداز میں اس سڑک پر سیکڑوں گھوڑوں کے مرنے کا تذکرہ کیا ہے۔اگر سیکڑوں گھوڑے انتقال فرما چکے ہیں تو ان سیکڑوں لوگوں کا کیا حال ہو گا جو ان گھوڑوں کے ساتھ منسلک ٹانگوں پر سوار تھے۔غور طلب پہلو یہ بھی ہے کہ ہائی وے اور سی ڈبلیو ڈی محکموں کی کام چوری بھی عیاں ہو رہی ہے۔

بند نمبر 3

آس پاس اس کے جو بستے ہیں نہ ان کی پوچھیے

جس قدر ویراں ہے یہ، ہیں اس قدر وہ خستہ حال

مفہوم:

اس سڑک کے ارد گرد بسنے والوں کی نہ پوچھیں۔سڑک کی حالت جتنی خراب ہے اس سے زیادہ یہ لوگ خستہ حال ہیں۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنزومزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے طنزومزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں وہ مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی اور اس کے عوام پر پڑنے والے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سڑک کھڈوں، کھائیوں اور گڑھوں کا مرکز ہے اس پر سفر اور ترسیلِ سامان مشکل ہے۔کئی ٹانگے الٹ چکے ہیں اور سیکڑوں گھوڑوں کا انتقال ہو چکا ہے۔

چنانچہ اب یہ سڑک ویران ہو چکی ہے اور جتنی یہ ویران ہے اس کے ارد گرد کے لوگ بھی اسی خستہ حالی اور ویرانی کا شکار ہیں گرد و غبار کے بادل اڑتے ہیں۔ ارد گرد کے بسنے والے جب نقل و حرکت ہی نہ کر سکیں اور ان کے لئے سفر کرنا محال ہو تو ان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کی خستہ حالی صاف ظاہر ہے۔ سڑک معاشی سرگرمی کا ذریعہ اور سفر کا وسیلہ ہوتی ہے۔ معاشی سرگرمیاں سامان اور افراد کی نقل و حرکت سے عبارت ہیں اور شاہراہیں اس میں معاون ہوتی ہیں۔ اگر سڑک کا یہ حال ہو کہ اس پر نقل و حرکت محال ہو تو معاشی حالت نہایت خراب ہو گی۔ یہی کیفیت مال گودام روڈ پشاور کی ہے۔ چنانچہ اس کے ارد گرد بسنے والے اس کی خرابی سے شدید متاثر ہیں اور شاعر کے بقول خستہ حال ہو چکے ہیں۔

غور طلب پہلو یہ ہے کہ شاعر نے اس پر سفر کرنے والے افراد اور جانوروں کی بدحالی کا ہی تذکرہ نہیں کیا بلکہ اس سے معیشت پر پڑنے والے اثرات کے نقطے کو بھی موضوعِ شعر بنایا ہے اور کہا ہے کہ جیسی حالت سڑک کی ہے ویسی ہی حالت اس کے ارد گرد بسنے والوں کی ہو چکی ہے۔

ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو اس سڑک کی خستہ حالی محکمہ ہائی وے اور سی ڈبلیو ڈی کی ذہنی اور انتظامی پسماندگی کو بھی اجاگر کر رہی ہے۔ اس سڑک کی حالتِ زار ان محکموں، جو اس کی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہیں، کے کارکنان کی کام چوری اور بے ایمانی کا بھی مظہر ہے۔

بند نمبر 4

رونقیں ہی رونقیں ہیں جس طرف بھی دیکھیے
چیخنے لگتے ہیں اس پر شام ہوتے ہی شغال

مفہوم:

یہ سڑک اتنی ویران ہے کہ شام ہوتے ہی اس پر گیدڑ چیخنے لگتے ہیں۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں وہ مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی اور ویرانی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہر کی یہ مشہور سڑک جو کبھی معاشی اور سفری سرگرمیوں کا پُر رونق مظہر تھی اب ویران ہو چکی ہے۔ وہ مزاحیہ رنگ میں کہتے ہیں کہ اس سڑک کی رونقیں دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیا ہی پر رونق سڑک ہے، جونہی شام ہوا اس کی رونق جوبن پر ہوتی ہے اور گیدڑ چیختے دوڑتے دکھائی و سنائی دیتے ہیں۔

مشرقی ادب میں گیدڑ کی موجودگی ہمیشہ ویرانوں اور جنگلوں میں پائی گئی ہے۔ اگر مال گودام روڈ پشاور پہ گیدڑ اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے ہیں تو صاف ظاہر ہے وہاں انسانوں کا گزر اب نہیں رہا۔ بنیادی شاہراہیں تو آٹھوں پہر مصروف ہوتی ہیں لیکن شہر کی بنیادی شاہراہ پر سرِ شام ہی گیدڑوں کی رونقیں نمودار ہوتی ہیں تو اس کا مطلب ہے بنی نوع انسان کا اس شاہراہ سے تعلق عرصہ دراز سے قطع ہو چکا ہے۔ شاہراہ کی رونق آمد و رفت ہے انسانوں، گاڑیوں اور سامان کی آمد و رفت۔ لیکن کمال بات ہے کہ مال گودام روڈ کی رونق گیدڑوں کی چوکڑیاں بھرنا اور ان کا چیخنا چلانا ہے۔

شاعر نے مزاحیہ انداز میں جہاں سڑک کی خستہ حالی کو اجاگر کیا ہے وہاں اس کی تعمیر و نگرانی کے ذمہ دار محکموں کی کارکردگی کی خستہ حالی کو بھی اجاگر کیا ہے کہ ماشاءاللہ ان کی شاندار کارکردگی کی وجہ سے یہ سڑک اب ویران ہو چکی ہے اور گیدڑوں کے لئے کھیل کود کا میدان بن چکی ہے۔

بند نمبر 5

لاریاں پٹرول کی دیکھو گے اس پر صبح و شام
ورنہ انسان تو نظر آتا ہے اس پر خال خال

مفہوم:

صبح و شام اس پر خراب گاڑیاں نظر آتی ہیں لیکن انسان نظر نہیں آتا۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی ممتاز مزاح نگار تھے۔ مشاہداتی مزاح نگاری کے ذریعے مسائل اجاگر کرنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔

زیرِ تشریح شعر میں وہ مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صوبائی مرکز پشاور شہر کی مرکزی شاہراہ مال گودام روڈ شدید شکست و ریخت کا شکار ہے اور کھڈوں، کھائیوں اور گڑھوں کا مرکز ہے۔ اس پر پٹرول گاڑیاں تو جابجا دکھائی دیتی ہیں لیکن یہ وہ گاڑیاں ہیں جو اس سڑک کی کھائیوں کو عبور کرنے میں اور یہاں حرکت کرنے میں ناکام رہیں۔ کسی کا ایکسل ٹوٹ چکا ہے تو کسی کا گئیر، کسی کے پہیے کام کرنے کے قابل نہ رہے تو کسی کے ٹائر پہیوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ بعض گاڑیوں کے انجن جو کئی گھوڑوں کی طاقت رکھتے تھے، جواب دے چکے۔ ظاہر ہے جس سڑک پر سیکڑوں اصلی گھوڑوں کا انتقال ہو چکا ہو وہاں گھوڑوں کی طاقت رکھنے والے انجن کیا چیز ہیں۔ پٹرول گاڑیاں عموماً طاقتور سمجھی جاتی ہیں لیکن مال گودام روڈ کی رکاوٹوں اور کھائیوں نے ان کی طاقت کا نشہ ہرن کر دیا ہے۔ اب یہ پٹرول گاڑیاں ڈھانچوں اور ٹکڑوں کی شکل میں اس سڑک پہ صبح و شام دکھائی دیتی ہیں لیکن انسان خال خال ہی دکھائی دیتا ہے، یہ سوار نہیں بلکہ پیدل آدمی ہوتا ہے۔ اور شاید ان گاڑیوں کی باقیات سے مستفید ہونے آتا ہے۔ سڑک ناکام عاشق کے دل کی مانند ہے۔ داغ ہیں، ٹکڑے ہیں، ویرانی ہے اور اداسی ہے۔ رونق مفقود ہو چکی کہ رونق کا باعث آمد و رفت جو غائب ہو چکی اور آمد و رفت کے غائب ہونے کی وجہ ہے اس سڑک کی خستہ حالی بلکہ خوفناک حالی۔

شاہراہوں کی تعمیر و ترقی کے ذمہ دار محکموں کی کارکردگی کی خستہ حالی صوبائی مرکز پشاور کی مرکزی شاہراہ کی خستہ حالی سے عیاں ہے۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

بند نمبر 6

اس میں ایسی کھائیاں ایسے ایسے غار ہیں
دفن ہو سکتا ہے جن میں آدمی بعد از وصال

مفہوم:

اس سڑک میں ایسی کھائیاں اور ایسے قبر نما غار ہیں کہ جن میں مرنے کے بعد انسان دفن ہو سکتا ہے۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی ممتاز مزاح نگار تھے۔ان کے طنز و مزاح پر مقامی اور مشاہداتی رنگ غالب ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کی صورتحال کی مضحک تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

تشریح طلب شعر میں مرزا محمود سرحدی مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی اور پریشان حالی کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہر کی مرکزی شاہراہ جو سفر اور ترسیلِ سامان کا بنیادی راستہ اور ذریعہ ہے اس کی حالت نہایت ابتر ہے۔ یہ سڑک اب کھائیوں، کھڈوں، غاروں اور گڑھوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔اس میں ایسی کھائیاں ایسے ایسے غار بن چکے ہیں کہ اس پر سفر کرنا تو کسی طور ممکن نہیں البتہ اس سڑک کو قدرتی قبرستان کہنا چاہیے۔ان گہری کھائیوں اور غاروں کی مشابہت قبروں سے ہے۔ان میں انسانوں کو مرنے کے بعد دفن کیا جا سکتا ہے۔ مرزا محمود سرحدی کی مزاحیہ رنگ میں سڑک میں موجودہ کھائیوں اور گڑھوں کو نمایاں کیا ہے اور یہ کہہ کر ان میں انسان کو مرنے کے بعد دفن کیا جا سکتا ہے،ان گڑھوں اور کھائیوں کی گہرائی کو اجاگر کیا ہے۔

سڑکیں اور شاہراہیں معیشت و روابط کی زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔انسان اور سامان کی بڑی نقل و حرکت سڑکوں سے ہو کر وقوع پذیر ہوتی ہے۔رستے ملک کے لیے اتنی ہی اہم ہیں جتنی دل کے لئے شریانیں اور وریدیں۔ جب شہ رگ ہی ترسیل خون کا کام نہ کر سکے تو دل کا کام ختم سمجھیں۔مال گودام روڈ شہر کی بڑی شاہراہ اور شہ رگ ہے۔اب جناب اس پر تو غار نما گہری کھائیاں ہیں۔ شہر کی بالخصوص اور سڑک کے ارد گرد رہنے والے لوگوں کی زندگی بالعموم پریشان حالی کا نمونہ بن چکی ہے۔دوسرے لفظوں میں شاعر کے بقول سڑک قبرستان کی قبروں کا نعم البدل ہے۔

شاعر نے مشاہداتی مزاح کے ذریعے سڑکوں کی تعمیر و ترقی کے ذمہ دار اداروں کی ذہنی خستہ حالی اور اخلاقی خستہ حالی اجاگر کی ہے کہ سی ڈبلیوڈی اور ہائی وے ڈیپارٹمنٹ نے کام چوری اور غیر ذمہ داری کی انتہا کر دی ہے،جو ان کے کارندوں کے اخلاقی دیوالیہ پن کا مظہر ہے۔

بند نمبر 7

ڈگمگا جاتے ہیں ریڑھے لڑکھڑا جاتی ہے جیپ
واپس آجائے سلامت سائیکل کی کیا مجال

مفہوم:

اس سڑک پر ریڑھے ڈگمگا جاتے ہیں اور جیپ لڑکھڑا جاتی ہے۔ سائیکل اس سڑک پہ جا کر سلامت واپس نہیں آسکتی۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

تشریح طلب شعر میں وہ مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاہراہیں ترسیلِ سامان اور سفر کا ذریعہ اور راستہ ہوتی ہیں۔ لیکن شہر کی یہ بنیادی شاہراہ کھڈوں، کھائیوں اور گڑھوں کا مرکز بن چکی ہے۔اس پر آمد و رفت ناممکن ہو چکی ہے۔ اگر کوئی ریڑھا اس سڑک پر سفر کے لیے آ ہی جائے تو ان کھڈوں، کھائیوں کو عبور کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ اکثر ریڑھے ڈگمگا جاتے ہیں اور کسی کھائی میں گرے ہوتے ہیں۔ جیپ جو کچے پکے راستے اور ڈھلوانی پتھریلے راستے بھی عبور کر لیتی ہے اس سڑک پر لڑکھڑاتی دکھائی دیتی ہے۔ لڑکھڑا کر

گرنا تو پھر اس کے لیے لازم ہے۔ اگر اس سڑک پر سائیکل چلائی جائے تو خواہ کتنی ہی احتیاط کی جائے، اس کا جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے اور واپس سلامتی سے نہیں آسکتی۔

سڑکیں آمدورفت کا بنیادی وسیلہ ہیں۔ انسانوں کی سفری اور کاروباری نقل و حرکت انہی پر ہوتی ہے۔ یہ ملکی اور معاشرتی جسم کے دل کی وریدیں ہیں۔ اگر وریدیں آمدورفت کے قابل نہ رہیں تو دل کا کام بند سمجھیں۔ اگر سڑک خراب ہے تو صاف عیاں ہے کہ معاشرتی اور تجارتی آمدورفت کا نظام خراب ہے اور اگر مال گودام روڈ جیسی بڑی شاہراہ کی اتنی بری حالت ہے تو سفری و تجارتی نقل و حرکت کی حالت بھی اتنی ہی بری ہوگی۔

شاعر نے مزاحیہ انداز میں سڑک کی خرابی کو اجاگر کیا ہے کہ اس پر ریڑھے اور جیپیں لڑکھڑاتی ہیں اور سائیکل تک سلامت واپس نہیں آتی۔ ایک تیسرے زاویے سے دیکھا جائے تو شاعر نے طنز و مزاح کے ذریعے سڑکوں کی تعمیر و ترقی کی محکموں کی کارکردگی کی خرابی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اگر بنیادی شاہراہ کا یہ حال ہے تو ان محکموں کی مجموعی کارکردگی پر بڑا سوالیہ نشان ہے۔

بند نمبر 8

مینہ برس جائے تو چل سکتی ہیں اس پر کشتیاں
ڈوب جانے کا بھی ہو جاتا ہے اکثر احتمال

مفہوم:

اگر بارش ہو جائے تو اس سڑک پر موجود گڑھوں کے پانی میں کشتیاں چل سکتی ہیں اور انسان کے ڈوبنے کا بھی احتمال ہے۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں وہ مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی کو مزاحیہ انداز میں اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سڑکیں ترسیل سامان اور سفر کا بنیادی ذریعہ ہوتی ہیں۔ شہر پشاور کی مرکزی شاہراہ جو پورے شہر کے تجارتی و معاشرتی روابط کا ذریعہ ہے، کی حالت نہایت خراب ہے۔ اس پر جگہ جگہ گڑھے، کھڈے اور کھائیاں بن چکی ہیں۔ یہاں جیپیں، ٹانگے الٹ چکے ہیں اور گھوڑوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہاں بارش ہو جائے تو یہ سڑک ندی نالے کا روپ دھار لیتی ہے اور اس میں آسانی سے کشتیاں چل سکتی ہیں اور کھڈوں اور گڑھوں میں پانی اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ڈوب جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ مرزا محمود سرحدی نے مزاحیہ انداز میں مال گودام روڈ کی بدحالی کو نمایاں کیا ہے کہ گڑھے اور کھڈے اتنے گہرے ہیں کہ اگر بارش کا پانی ان میں کھڑا ہو جائے تو کشتیاں چلانے اور ڈوبنے کا موقع بن جاتا ہے۔ یہ کیسی سڑک ہے جہاں سے انسان کا سفر آسان ہونے کی بجائے تکلیف دہ بن جائے۔

عام راستے ہوں یا بڑی اور مرکزی شاہراہیں، روابط اور نقل و حرکت کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ انہیں باسہولت ہونا چاہیے۔ تکلیف دینے کے بجائے آسانی دینے والا ہونا چاہیے۔ یہ کاروباری زندگی کے لیے اتنی ہی اہم ہیں جتنی دل کے لیے شریانیں۔ اگر شہ رگ ہی خون کے لوتھڑوں سے بند ہو تو دل کا کام بند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مال گودام روڈ جو شہر کی مرکزی شاہراہ ہے، اس کی حیثیت کاروباری یا تجارتی امور کے لیے شہ رگ کی ہے

کیونکہ سامان کی بڑی ترسیل کا کام اسی کے ذریعے ہوتا ہے۔اب اس کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے۔جب اس پر گڑھے اور غاریں ہیں تو تجارتی نقل و حرکت کا کام مفقود سمجھیں۔

ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو اس مرکزی شاہراہ کی بدحالی سڑکوں کی تعمیر و مرمت کے ذمہ دار اداروں کی کام چوری اور خراب کارکردگی کا مظہر ہے۔سی ڈبلیو ڈی اور ہائی وے نے اپنی ذمہ داریاں نہیں نبھائیں۔شاعر معاشرے کا ذہن ہوتا ہے۔مرزا محمود سرحدی نے اس اہم مسئلہ کو مزاح نگاری سے اجاگر کر کے سامان مزاح ہی مہیا نہیں کیا بلکہ اس تکلیف دہ شہری مسئلے کو اجاگر کر کے قومی خدمت کی ہے۔

بند نمبر9

اس کی ڈھلوانوں پہ موٹر کا دھڑک جاتا ہے دل
اس کے موڑوں پر لرز جاتے ہیں اکثر باکمال

مفہوم:

اس کی ڈھلوانوں پر گاڑیوں کے دل لرزتے ہیں اور اس کے موڑوں پر باکمال ڈرائیور بھی کانپ جاتے ہیں۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

تشریح طلب شعر میں وہ مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مال گودام روڈ شہر کی بڑی اور مرکزی شاہراہ ہے۔سامان کی ترسیل اور عوامی سفر کا بنیادی راستہ ہے۔اپنی اہمیت کے باعث اس کی حالت بہت اچھی ہونی چاہیے لیکن اس کی حالت نہایت خراب ہے۔اس پہ جابجا کھڈے، کھائیاں اور گڑھے بن چکے ہیں۔نشیب و فراز اور ڈھلوانیں بن چکی ہیں۔اس کی ڈھلوانوں پر موٹر گاڑی زور لگا کے چیخنے لگ جاتی ہے۔ہر گاڑی گھبراتی ہے اور اس کا دل خوفناک ڈھلوانوں کو دیکھتے ہی دھک دھک کرنے لگتا ہے۔اس باکمال سڑک پر ایسے ایسے موڑ بن چکے ہیں کہ بڑے بڑے ماہر ڈرائیور گاڑی چلاتے وقت لرزنے لگتے ہیں۔

سڑکیں اور شاہراہیں ترسیلِ سامان اور سفر کا بنیادی ذریعہ ہیں۔اس کے بغیر انسان و سامان کی نقل و حرکت مشقت طلب کام ہے۔رستے ملک کے لیے اتنے ہی اہم ہیں جتنی دل کو فراہمی خون کے لیے شریانیں اور وریدیں۔جیسے شریانوں میں بندش امراضِ قلب اور دل کے دورے کا باعث ہے اسی طرح سڑکوں کی خرابی نقل و حرکت کیلئے خرابی کا باعث ہوتی ہے۔مال گودام روڈ پشاور شہر کی مرکزی شاہراہ ہے اور یہ شہر صوبائی مرکز بھی ہے۔اس کی حالت یہ ہے کہ اس پر خطرناک موڑ اور پُرخطر نشیب و فراز وجود میں آچکے ہیں۔ان پر گاڑی چلاتے ہوئے ماہر ڈرائیور کا دل لرزتا ہے اور گاڑی کا انجن چیخنے اور گریہ وفریاد کرنے لگ جاتا ہے۔

دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو بذریعہ مزاح مرزا محمود سرحدی نے سڑک کی تعمیر و مرمت کے محکموں کی خراب کارکردگی کو بھی اجاگر کیا ہے کہ کس جانفشانی اور توجہ سے وہ کام چوری اور غیر ذمہ داری کے مرتکب ہوئے ہیں۔سی ڈبلیو ڈی اور ہائی وے کی مجرمانہ غفلت کے باعث سڑک غاروں، کھائیوں اور گڑھوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔

بند نمبر10

اس پہ جانے کا کبھی ہوتا ہے جس کو اتفاق

اس کے لوٹ آنے کا پیدا ہی نہیں ہوتا سوال

مفہوم:

اس سڑک پر جو چلا جائے اس کے لوٹ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی کا شمار اردو کے ممتاز مزاح نگار شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کی مضحک تصویریں شاعرانہ مہارت سے اجاگر کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں مرزا محمود سرحدی مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی کو مزاحیہ انداز میں نمایاں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مال گودام روڈ پشاور شہر کی مرکزی شاہراہ ہے جو نقل و حرکت کا مرکزی ذریعہ ہے، اس پہ گڑھے، کھائیاں، اور کھڈے بن چکے ہیں۔ اس پہ گاڑیاں چلنا تو محال گھوڑوں کا گزر مشکل ہے اور کئی گھوڑوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ گاڑیاں اور سائیکل اگر اس سڑک پہ چلے جائیں تو واپس آنا ناممکن ہے۔ اس سڑک کی حالت اتنی خراب ہے کہ اگر کوئی شخص اس پر سفر کا ارادہ کرلے یا اتفاقاً آجائے تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سلامتی سے لوٹ آئے۔ جس سڑک پہ اتنے گہرے غار ہوں کہ وہاں انسان بعد از مرگ دفنایا جاسکے وہاں سفر کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

چھوٹی سڑکیں ہوں یا بڑی شاہراہیں نقل و حرکت کا بنیادی وسیلہ ہوتی ہیں۔ سامان کی ترسیل اور انسانی سفر انہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ جیسے نظامِ دورانِ خون کا عمل شریانوں اور وریدوں کے ذریعے ہوتا ہے اور اگر شریانوں میں بندش پیدا ہو جائے تو ترسیلِ خون اور عملِ قلب خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شاہراہوں کی خرابی کاروباری اور تجارتی سامان کی نقل و حمل اور انسانی نقل و حرکت میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ جب سڑک ایسی ہو کہ اس پر اگر اتفاقاً سفر کیا جائے تو زندہ سلامت واپس آنے کا امکان نہ ہو تو وہاں معیشت اور انسانی روابط کی کیا حالت ہو گی؟

تیسرے زاویے سے دیکھا جائے تو شاعر نے مزاحیہ انداز میں سڑکوں کی تعمیر و مرمت کی ذمہ دار اداروں کی ذہنی پسماندگی، غیر ذمہ داری اور کام چوری کو بھی اجاگر کیا ہے کہ مال گودام روڈ پشاور کی ناگفتہ بہ حالت، جس پر غار گڑھے، کھڈے اور کھائیاں ہیں، سے ان اداروں یعنی سی ڈبلیو ڈی اور ہائی وے کی کارکردگی کی حالت زار صاف عیاں ہے۔

بند نمبر 11

سوچتا رہتا ہوں کب میرے وظیفے کی طرح

اس کی بدحالی کا آتا ہے حکومت کو خیال

مفہوم:

میں سوچتا رہتا ہوں کہ میرے وظیفے کی طرح اس سڑک کی بدحالی کا حکومت کو کب خیال آتا ہے۔

تشریح:

مرزا محمود سرحدی اردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کی مزاحیہ تصویریں شاعرانہ فنکاری سے اجاگر کرتے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں مرزا محمود سرحدی مال گودام روڈ پشاور کی خستہ حالی اور حکومت کی بے توجہی کو نمایاں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مال گودام روڈ پشاور شہر کی مرکزی شاہراہ ہے جس کے ذریعے بنیادی تجارتی اور انسانی نقل و حرکت ہوتی ہے۔اس کی موجودہ حالت یہ ہے کہ اس پر گڑھے، کھائیاں، کھڈے اور غاریں وجود میں آچکی ہیں اور گاڑیوں کا گزرنا محال ہے۔ کئی گھوڑے ان رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے انتقال کر چکے ہیں۔ اگر اتفاقاً اس پر سفر کیا جائے تو واپس زندہ سلامت آنا ناممکن ہے۔ یہاں برسات میں کشتیاں چل سکتی ہیں۔اس پر موجود غاروں میں بعد از مرگ انسان دفن ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ سڑک جو مرکزی سڑک ہے ناقابل سفر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں مسلسل سوچتا رہتا ہوں کے حکومت کو کب اس کی بدحالی کا خیال آئے گا۔ حکومت ہر معاملے میں ہی سست ہے۔ میرا وظیفہ جو حکومت سے وصول ہوتا ہے اس کی حالت بھی مال گودام روڈ پشاور کی طرح خراب ہے۔ایک تو مالیت کم بلکہ معمولی اور اوپر سے بہت سی رکاوٹوں کو عبور کرکے، حالات کی سختی سہہ کر وصول ہوتا ہے۔

شاعر نے مزاحیہ انداز میں سڑک کی خستہ حالی کے ذکر میں اپنے وظیفے کا ذکر کر کے تفنن میں اضافہ کر دیا ہے۔ سڑک کی خستہ حالی کو اپنے وظیفے سے تشبیہ دی ہے اور سڑک کی تمام حالتِ زار سے اپنے وظیفے کی حالتِ زار اجاگر کی ہے۔ نیز حکومت سڑک کی تعمیر و مرمت میں سست روی اپنے وظیفے کے معاملے میں حکومتی سست روی سے تشبیہ دی ہے کہ جیسے حکومت میرے وظیفہ کی حالت اور فراہمی میں سست اور بے عملی کا شکار ہے ایسے ہی سڑک کی تعمیر و مرمت میں سستی کام چوری اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ شاعر ممتنی ہے کہ حکومت کے سڑک کی تعمیر و ترقی کے ذمہ دار ادارے اور شاعر کے وظیفے کی بہتری و فراہمی کے ادارے جلد متحرک ہوں اور مال گودام روڈ پشاور کی خستگی و بدحالی کو دور کریں نیز شاعر کے معمولی قیمت پر مشتمل وظیفے کی حالتِ زار کو بھی درست کریں۔

21 ۔ مصیبت بھی راحت فضا ہو گئی ہے

حسرت موہانی

شعر1

مصیبت بھی راحت فضا ہو گئی ہے
تِری آرزو رہنما ہو گئی ہے

مفہوم:

تجھے پانے کی خواہش میں ہر مصیبت راحت فزا ہے۔

تشریح:

حسرت موہانی اردو ادب کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ عشق حقیقی، غم دوراں اور غم جاناں پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی محبتوں کے ترجمان بھی ہیں اور تلخیوں کے عکاس بھی۔

تشریح طلب شعر میں وہ راہِ وفا اور عشقِ حقیقی کی راہ میں آنے والی مصیبتوں کے راحت بڑھانے کا باعث بننے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ راہِ شوق میں اور راہِ سلوک میں جب سے میں اللہ کے قرب اور خوشنودی کا آرزو مند بنا ہوں اور اس کی رضا کے لئے محنت کی ہے تو اس کام میں طرح طرح کے مصائب، رکاوٹوں، مصیبتوں اور بلاؤں نے مجھے شکستہ دل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ پریشانیاں میری راحت میں اضافے کا باعث بنیں کیونکہ راہِ خدا میں آنے والی ہر مصیبت سے مجھے مزید سکون ملا۔ ان پریشانیوں رکاوٹوں کے باوجود میں عازم سفر ہوں۔ اپنے مقصد سے ہٹا نہیں اور اللہ کے نزدیک مزید پسندیدہ بن گیا ہوں کہ سب تکلیفیں سہہ کر بھی اس کی خوشنودی کا متمنی ہوں۔

بس تیری رضا تیری خوشنودی ہمیں ملے
وہ غم سرمایا ہے جو تیری راہ میں ملے

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کی میراث اور ان کی سنت ہے کہ انسان تکلیفیں سہے اور خدا کی رضا پہ عمل جاری رکھے۔ ایسے حالات میں اللہ کی مدد شاملِ حال ہو جاتی ہے اور ہجومِ بلا انسان کو مایوس نہیں کرتا، ایک شاندار منزل یعنی اللہ کا قرب سامنے ہوتی ہے۔

ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے
مایوس کر سکا نہ ہجومِ بلا مجھے

مجازی معنوں میں دیکھا جائے تو شاعر کا مطمع نظر محبوب کی محبت والفت ہے اب اس راہ میں آنے والی مصیبتیں پریشانیاں سکون آور اور راحت فضا ہیں۔ جب محبوب کا پیار من میں جاگا ہو۔ اس کی یاد دل میں رچی بسی ہو تو کڑا وقت کوئی معنی نہیں رکھتا۔

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں (ناصر)

بشیر بدر نے تو محبوب کی یاد اور محبت کو حیات کے تمام غموں کا سائبان کہا ہے۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

شعر 2

یہ وہ راستا ہے دیارِ وفا کا
جہاں بادِ صرصر، صبا ہو گئی ہے

مفہوم:

راہِ وفا میں گرم ہوا بادِ نسیم محسوس ہوتی ہے اور مصیبت خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

تشریح:

مولانا حسرت موہانی کا شمار اردو کے نمائندہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ عشقِ حقیقی، حُبِ وطن اور معاملاتِ محبت پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی امنگوں، جذبوں اور حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔ تشریح طلب شعر میں وہ راہِ وفا کی مصیبتوں کے راحتوں میں بدلنے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وفا کی گلی میں، محبت کی راہ میں گرم لو بادِ نسیم اور بادِ شمیم کا سا احساس دلاتی ہے۔ اگرچہ راہِ وفا پُر خار اور مصائب سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن یہ تکالیف اس راہ میں خوشگوار لگتی ہیں اور انسان ہنستا کھیلتا ان کو جھیلتا جاتا ہے اور اس راہ کے غم میں بھی مزا محسوس کرتا ہے۔

یہ نادر رواج ہے رہِ شہرِ وفا کا
یہاں کی لو میں کیف ہے بادِ صبا کا

حسرت موہانی نے حُبِّ وطن میں طویل قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ جیل میں چکی کی مشقت جھیلی۔ جب مقصد اعلیٰ و ارفع ہو اور دھرتی سے وفا کا معاملہ ہو تو انسان جان بھی نثار کر دیتا ہے۔ اس راہ کی سختیاں تکلیف انگیز نہیں ہوتیں۔ حسرت موہانی بھی بین السطور یہی بات اجاگر کر رہے ہیں کہ مٹی سے پیار ہے۔ وطن کا کانٹا سنبل و ریحان سے بھی پیارا ہے۔ اب کال کوٹھڑی کی اذیت، افرنگی استعمار کا نفسیاتی و جسمانی تشدد اور جیل کی سختیاں اس وطن سے وفا کی راہ میں تکلیف نہیں بلکہ تسکین دیتی ہیں۔

وفا کی راہ میں اپنی ثابت قدمی اور ایثار سے اہلِ وفا نے قدم قدم یادگار بنا دیا ہے۔ وفا شعار آتش نمرود میں بے خطر کود ے، سرِ وادیِ طائف رہ گزر کو اپنے مقدس وفا شعار خون کے رنگ و بو سے منور کیا۔ قربانی کے لئے چھری گلے پہ چلوائی۔ چناب میں کچے گھڑے پہ کود ے۔ مطلوب کی خواہش میں فرہاد نے کوہ کنی کی لیکن یہ سب تکلیفیں ذریعہ سکون بن گئیں کہ منزل کے حصول میں سب خار گل محسوس ہوتے ہیں اور مصیبت خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شعر 3

میں درماندہ اس بارگاہِ عطا کا
گُنہ گار ہوں اک خطا ہو گئی ہے

مفہوم:

میں اس بارگاہ عطا کا خستہ حال گنہگار اور خطاکار ہوں اور معافی کا طلب گار ہوں۔

تشریح:

مولانا حسرت موہانی کا شمار اردو کے نمائندہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ عشقِ حقیقی، حُبِ وطن اور معاملاتِ محبت پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی امنگوں، جذبوں اور حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ احساسِ ندامت سے دوچار گنہگاری پر عاجز اور معافی کے خواستگار ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ سب نعمتیں اسی کے حضور سے عطا ہوئی ہیں۔ میں مقصد تخلیق بھول گیا ہوں۔ مجھے نیابت کے لیے نعمت دے کر بھیجا گیا اور اخروی زندگی کی بنیاد بھی یہی کار کردگی ٹھہرائی گئی لیکن میں بھٹک گیا اور راہِ راست سے ہٹ گیا۔ چنانچہ خستہ حال اور پریشان حال ہو چکا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ میں گناہ کا مرتکب ہوا ہوں۔ انسان خطا کا پتلا ہے، اس سے لغزش ہو جاتی ہے۔ بشری تقاضوں میں احتیاط اور پرہیز گاری کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ مجھ سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن باری تعالیٰ تو رحیم و غفور ہے، بخش دیتا ہے، توبہ قبول کرتا ہے، سو بار بھی توبہ توڑیں پھر معاف کر دیتا ہے اگر انسان باز آ جائے۔ میں بھی معافی کا طالب ہوں اور غلطیوں پر نادم ہوں اور صراط مستقیم تھامنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے، تو مجھے بخش کر مزید نعمتوں سے نوازے گا۔

"بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔(القرآن)

چلے ہم نقدِ عصیاں لے کر آمرزش کے سودے کو
کہ نرخ اس جنس کا کچھ بھی نہیں رکھا گراں تو نے

شعر 4

ترے رتبہ دانِ محبت کی حالت
ترے شوق میں کیا سے کیا ہو گئی ہے

مفہوم:

تیری محبت میں مرتبہ پانے والوں کی حالت تجھے پانے کی جستجو میں کیا سے کیا ہو گئی ہے۔

تشریح:

مولانا حسرت موہانی کا شمار اردو کے نمائندہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ عشقِ حقیقی، حُبِ وطن اور معاملاتِ محبت پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی امنگوں، جذبوں اور حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔

بحث طلب شعر میں وہ اپنے لامحدود عشق کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے رب دو جہاں تیری رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے تیرے احکامات بجا لایا اور صراط مستقیم پر چلتے ہوئے طرح طرح کے مصائب و آلام کا سامنا کیا۔ تجھے پانے کی جستجو میں حالت خراب ہو گئی۔ زندگی کے سارے عوامل درہم برہم ہو گئے لیکن ہم تیری محبت و جستجو میں ثابت قدم رہے۔

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا (درؔد)

ہم اس حقیقت سے آشنا تھے کہ راہِ عشق پہ چلنا آسان نہیں۔ رنگ و روپ بکھر جاتا ہے۔ اہل خانہ سے دُکھ ملتے ہیں۔ عقل کے سوگ اور دل کے روگ لاحق ہو جاتے ہیں اور زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

حسرت کہتے ہیں کہ اس حقیقت سے آشنائی کے باوجود ہم رہِ نوردِ شوق رہے۔ رہِ سلوک پہ گامزن رہے۔ آزمائش وابتلاء کو خاطر میں نہ لائے۔ تیری رضااور خوشنودی کے حصول کے لئے ہر مشکل کا ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ کاش تمہاری اک ذراسی توجہ ادھر ہو جاتی تو ہماری بگڑی بھی بن جاتی، ہماری مشکلیں بھی آسان ہو جاتیں۔ تم تو مالک و مختار ہو تمہارا افضل ہوتا تو ہماری زندگی سنور جاتی۔ دیکھئے تو آپ کے عشق میں مراتب و مدارج حاصل کرنے کے باوجود ہماری حالت کتنی خراب ہو چکی ہے۔

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے

ادھر تو نے لیکن دیکھا نہ دیکھا (دردؔ)

مجازی معنوں میں شاعر محبوب سے شکوہ کناں ہے کہ اس کی تمام تر چاہت اور محبوب کو پانے کی حسرت کے باوجود اسے وصلِ محبوب اور نظرِ التفات حاصل نہیں ہوئی۔ محبوب کی محبت میں زمانے میں عاشقِ زار مشہور ہوئے تو رسوا ہوئے۔ پھر عاشقِ صادق کا لقب ملا۔ محبت میں تو یہ بڑا رتبہ ہے کہ زمانہ جو کبھی کسی کا نہیں ہوتا میری محبت کا قائل و شاہد ہے۔ لیکن تیری بے رخی قائم و دائم ہے، جس کے باعث حالتِ جنوں میں ہم اپنی شخصیت کو مسخ کر بیٹھے، اپنی حالت بگاڑ بیٹھے مگر تمہارے دل میں کبھی نرمی اور محبت پیدا نہیں ہوئی۔

تیری بے وفائیوں پر تیری کج ادائیوں پر

کبھی سر جھکا کے روئے کبھی منہ چھپا کے روئے (سیف الدین سیفؔ)

شعر 5

پہنچ جائیں گے انتہا کو بھی حسرتؔ

جب اس راہ کی ابتدا ہو گئی ہے

مفہوم:

جب منزلِ مقصود کے لیے نکل پڑا ہوں تو اے حسرتؔ منزل تک بھی پہنچ ہی جاؤں گا۔

تشریح:

مولانا حسرتؔ موہانی کا شمار اردو کے نمائندہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ عشقِ حقیقی، حُبِ وطن اور معاملاتِ محبت پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی امنگوں، جذبوں اور حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔

زیرِ بحث شعر میں وہ کہتے ہیں کہ جب کسی منزل کے لئے انسان نکل پڑے تو منزل تک بھی پہنچ ہی جاتا ہے۔ انسان ہمت کرکے کام کی شروعات کر دے تو تکمیل ہو ہی جاتی ہے۔ انسان منزل کی راہ میں موجود خطرات کے بارے میں سوچ کر بے حوصلہ ہو جاتا ہے اور عازمِ سفر ہونے سے ہچکچاتا ہے۔ یوں کام کا آغاز ہی نہیں ہو پاتا لیکن اگر ہمت کرکے انسان نکل پڑے تو راستے میں بہت سے مددگار مل جاتے ہیں اور فطرت کے عناصر درخت بھی سایہ مہیا کرتے ہیں۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

رستے میں مشکلات ہوتی ہیں تو ہم خیال مددگار بھی مل جاتے ہیں اور سفر آسان ہو جاتا ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

حسرت موہانی کا مطمع نظر قربِ خدااور پھر غیر ملکی استعمار سے دھرتی کی آزادی ہے۔حُبِّ وطن میں حسرت نے قید وبند کی سختیاں جھیلیں اور آزادی کی جدوجہد کی۔اس شعر میں وہ اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اگرچہ یہ ابتدا ہے لیکن جب ابتدا ہو گئی ہے، جدوجہد کا آغاز ہو گیا ہے تو منزل دور نہیں۔جہد مسلسل سے منزل کو حاصل کر ہی لیں گے۔اگرچہ غلامی کی رات طویل ہے لیکن قافلہ صبح،شب کی منزلوں کو طے کرتا رہا تو سحر ضرور ہو گی۔غلامی کے مصائب کا خاتمہ ضرور ہو گا۔

طول غمِ حیات سے نہ گھبرا اے جگر
ایسی بھی کوئی رات ہے جس کی سحر نہ ہو

حسرت امید پرست ہیں۔مصائب انسان کو تھکا دیتے ہیں،مایوس کر دیتے ہیں لیکن حسرت ناامید نہیں ہوئے۔جب عزم پکا ہو اور خدا پر بھروسہ ہو تو انسان کڑی دھوپ کا سفر طے کر کے منزل تک پہنچنے کی کوشش نہیں چھوڑتا اور مایوس نہیں ہوتا۔

ہر حال میں رہا جو تیرا آسرا مجھے
مایوس کر سکا نہ ہجومِ بلا مجھے (حسرت موہانی)

جب منزل مقصود کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا ہے تو کوشش بار آور ہو گی اور منزل تک ضرور پہنچیں گے۔

22 ۔ آدمی آدمی سے ملتا ہے

جگر مراد آبادی

شعر1

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

مفہوم:

انسان انسان سے ملتا ہے لیکن قلبی لگاؤ کم کسی سے ہوتا ہے۔

تشریح:

جگر مراد آبادی کا شمار سر کردہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی جگر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور قلبی کیفیات کے عکاس بھی۔ تشریح طلب شعر میں انہوں نے انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے دل کے کسی کسی سے لگنے کے فلسفے کو بیان کیا ہے۔ انسان کی معاشرتی زندگی بہت سے لوگوں سے تعلقات پر مبنی ہوتی ہے۔ مختلف مزاجوں، عمروں اور طبقوں کے افراد سے شخصی تعلق داری قائم ہوتی ہے لیکن قلبی لگاؤ کم ہی کسی سے استوار ہوتا ہے۔ دل کی پسند کے معیار پہ پورا اترنے والے افراد کم ہوتے ہیں۔ ہم خیال اور پسندیدہ افراد کی کمی کے باعث کم لوگوں سے دل لگی ہوتی ہے۔ امنگوں، جذبوں، خواہشوں کے اعتبار سے ہر کسی کا قلبی معیار پر پورا اترنا ممکن نہیں جہاں ہم آہنگی ہو گی وہیں دل وابستگی ہو سکتی ہے۔ شاعر گہری چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ زخم خوردہ ہے۔ محبوب کی بے اعتنائی اور بے وفائی کے سبب دلی مطلع پر اداسی اور محرومی کے گہرے بادل چھائے ہیں۔ بے چینی اور مایوسی ہے۔ جب اندر کا موسم درست نہ ہو تو باہر کے معاملات پر اثرات پڑتے ہیں اسی لیے شاعر کا دل باہر نہیں لگ رہا۔

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی (ناصر کاظمی)

جگر کے اس شعر میں ایک اجتماعی مفہوم بھی پنہاں ہے۔ انسانوں کے درمیان ہم خیالی یکسوئی، الفت و محبت کا فقدان ہے۔ انسانی زندگی مزاجوں کے تضاد اور طبقوں کی تفریق کا دوسرا نام ہے۔ انسان انسانوں سے ملاقات کرتے ہیں، ایک جیسے جسم اور نقوش بھی رکھتے ہیں لیکن ان کی قلبی وابستگی نہیں ہوتی۔ دلوں کے درمیان بُعدِ شرق و غرب ہے رنگ و نسل، غربت و امارت مذہب و ملت کی وہ تفریق ہے کہ دل آپس میں جڑتے ہی نہیں۔

شعر2

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

مفہوم:

وہ اتنی معصومیت سے ملتا ہے کہ میں اس کے ستم بھول جاتا ہوں۔

تشریح:

جگر مراد آبادی کا شمار سر کردہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی جگر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور قلبی کیفیات کے عکاس بھی۔ تشریح طلب شعر میں شاعر نے محبوب کی معصومانہ ادا اور سادہ روی کے سبب، اس کے ظلم و ستم کی فراموشی کا تذکرہ کیا ہے۔

محبوب کے ظلم و ستم کے باعث شاعر اندر ہی اندر دکھی ہے اور محبوب کے ستم کی یاد اس کے ذہن پر مسلسل ضرب لگاتی رہتی ہے لیکن جوں ہی محبوب سے ملاقات ہوتی ہے۔ محبوب اس معصومیت و سادہ روی سے ملتا ہے، گویا اس نے جان بوجھ کر اپنے محبؔ پر کوئی ظلم نہ کیا ہو۔ اور جو ظلم بھی شاعر پر ہوا، انجانے میں ہوا۔ حتّٰی کہ محبوب کا برتاؤ یوں ہوتا ہے گویا اس نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ شاعر جب محبوب کی یہ سادہ روی دیکھتا ہے تو اس کی سب زیادتیاں فراموش کر دیتا ہے۔

محبوب خواہ کتنا ہی ستمگر کیوں نہ ہو اس کی بے رخی اور بے اعتنائی پر محبؔ کتنا ہی برگشتہ کیوں نہ ہو۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو اس کی ادائیں سب کچھ بھلا دیتی ہیں اس کی صورت، اس کی باتیں، اس کی ذات کسی اور طرف دھیان ہی جانے نہیں دیتی۔ شاعر کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شعر 3

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ، تیری ہنسی سے ملتا ہے

مفہوم:

آج کھلے پھولوں میں محبوب کی ہنسی کا رنگ موجود ہے۔

تشریح:

جگر مراد آبادی کا شمار سر کردہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی جگر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور قلبی کیفیات کے عکاس بھی۔ تشریح طلب شعر میں جگر محبوب کے حسن و جمال بالخصوص اس کے کھلے ہوئے پھولوں جیسی لافانی ہنسی کی توصیف بیان کر رہے ہیں کہ نہ جانے آج کیا بات ہے میرے محبوب کی ہنسی میں گل و گلزار سے مشابہت موجود ہے۔ یوں تو میرا محبوب حسن و جمال کا مرقع، پری وش اور پری پیکر ہے اس کی ہنسی بھی خوبصورتی کا شاہکار ہے اور اس کے ہنسنے سے کھلے پھولوں کی یاد آتی ہے۔

انگلی دبا کے دانت میں وہ مسکرا دیئے
بس اتنی سی بات نے طوفاں اٹھا دیے

محبوب محبت کا مرکز ہے اور محبّ کے خواب و خیال کا محور ہے، محبوب کی ایک تیکھی نگاہ بے چین کر دیتی ہے تو اس کی ایک مسکراہٹ دل میں بہار کا سماں پیدا کر دیتی ہے۔اس کی ایک ایک ادا توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔اس کی خوبصورتی قلب و نظر میں چھائی ہوتی ہے۔

دل اک مندر ہے، آپ مورت ہیں
آپ کتنے خوب صورت ہیں

اسی خوبصورتی کا ایک پہلو مسکراہٹ اور ہنسی بھی ہے۔ محبوب کی ہنسی لاثانی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج گلہائے رنگا رنگ کھلے دیکھے، پھولوں کی رعنائی اور دلفریبی دیکھی تو وہ اپنے پورے جوبن پہ تھے۔اتنی اعلیٰ دلکشی میں اب تیری ہنسی جیسا رنگ ابھر آیا تھا۔ گویا محبوب کی ہنسی پھولوں سے بھی دلفریب ہے۔آج کے کھلے پھول اپنی خوبصورتی میں بے مثال ہیں تب ہی ان میں تیری ہنسی کا سا عکس ہے۔علامتی طور پر شاعر کا کہنا ہے کہ محبوب ہنسے تو دل میں بھی بہار آ جاتی ہے اور ارد گرد بھی پھول کھل اٹھتے ہیں، قلب و نظر سرشار ہو جاتے ہیں۔

کھلتی ہنسی نے سکھائی پھولوں کو دلکشی
غنائی قہقہوں نے سکھایا چٹکنا کیا چیز ہے

شعر 4

سلسلہ، فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

مفہوم:

میرے محبوب کی قامت میں قیامت کی خوبصورتی ہے۔

تشریح:

جگر مراد آبادی کا شمار سر کردہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی جگر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور قلبی کیفیات کے عکاس بھی۔ تشریح طلب شعر میں شاعر محبوب کے خوبصورت اور متناسب قد کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قیامت کے ہنگامے کے سارے سلسلے تیری حسین قامت سے جا ملتے ہیں، تیرا قد و قامت قیامت کی خوبصورتی کا حامل ہے۔ محبوب کے حسن و جمال کی دلفریبی شعرا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ خوبی اور خوبصورتی اپنی تحسین خود کرواتی ہے۔ چنانچہ جگر بھی اپنے محبوب کے حسین سراپے کی رعنائی سے بے حد متاثر ہیں۔ اگرچہ قیامت کا دن بہت ہنگامہ خیز ہو گا۔ نفسا نفسی کا عالم ہو گا۔ خلق خدا بے حال ہو گی۔ کچھ سجھائی نہ دے گا۔ شاعر کے خیال میں محبوب کا دلفریب سراپا دیکھ کر قیامت کا سا تاثر ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ انسان بے خود اور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ قلب و نظر اس جلوے کی تاب نہیں لا سکتے۔ دل و دماغ میں قیامت کا ہنگامہ پیدا ہوتا ہے۔ آنکھیں حیرت سے جمی رہ جاتی ہیں۔ ذہن اسی کی رعنائی پر ٹکا رہ جاتا ہے۔ وہ بے خودی طاری ہوتی ہے کہ ارد گرد کا ہوش نہیں رہتا یوں لگتا ہے کہ قیامت کا ہنگامہ یہی ہے۔

تیرے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں (غالبؔ)

قد و قامت کو شخصی وجاہت میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ قامت خواہ جسمانی ہو یا عقلی، عزت کی ہو یا عمارت کی، ہمیشہ وقعت رکھتی ہے، اور تحسین کی حقدار ہوتی ہے۔ شخصی خوبصورتی میں پورا سراپا مل کر قد و قامت کو تشکیل دیتا ہے اور جاذب نظر بناتا ہے۔ چنانچہ قامتی وجاہت مرکزِ نگاہ بنا جاتی ہے وہ محبوب کے محبؔ شاعر تحسین کے کلمات کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

ادھر دیکھو قیامت چلی آرہی ہے

شعر 5

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا

ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

مفہوم:

محبوب کی بے رخی کے باوجود میرا دل اسی سے چاہت سے ملتا اور پیار کرتا ہے۔

تشریح:

جگرؔ مراد آبادی کا شمار سر کردہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی جگر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور قلبی کیفیات کے عکاس بھی۔

تشریح طلب شعر میں جگرؔ محبوب کی بے رخی اور بے اعتنائی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب سے ملاقات تو ہوتی ہے لیکن اس کا ملنا اور نہ ملنا برابر ہے۔ محبوب چاہت سے نہیں ملتا بلکہ قلبی فاصلوں سے اور عام واقف کے سے انداز سے ملتا ہے۔

کون کہتا ہے ملاقات نہیں ہوتی

روز ملتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی

محبوب دل کی رونق، آنکھوں کی ٹھنڈک اور خیالوں کا محور ہوتا ہے۔ محبؔ کی خواہش ہوتی ہے کہ جواب میں بھی اسی طرح کی محبت حاصل ہو جیسی وہ محبت رکھتا ہے۔ لیکن یہ خواہش بعض اوقات نہ پورے ہونے والے ارمان بن کر رہ جاتی ہے چنانچہ جب فریق مخالف یعنی محبوب سے وہ التفات حاصل نہیں ہوتی تو اک بے قراری اور بے چینی محبؔ کا مقدر بن کر رہ جاتی ہے۔ محبوب سے ملاقات ہو بھی تو اس میں محبت کی گرم جوشی نہ ہونے کے باعث تشنہ کام ملاقات ثابت ہوتی ہے۔

جب دل ہی نہ مل پائیں تو ملنے سے کیا حاصل

یوں تو صحرا بھی سمندر سے ملا کرتے ہیں

جگرؔ احساس محرومی سے دوچار ہیں۔ وہ محبوب کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی محبوب کے نام کر چکے ہیں۔ لیکن ان کی چاہت کی قدر نہیں اور اس کا محبوب پر کوئی اثر نہیں۔ وہ شکوہ کناں ہیں کہ ان کا محبوب ان سے دوری اور بے پروائی برتتا ہے، ملاقات ہو تو بھی نہ گرمی جذبات اور نہ ہی نظر التفات۔ وہ مل کر بھی نہ ملنے جیسا ہی ملتا ہے۔

ملنا تیرا نہیں آساں تو سہل ہے

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو شاعر نے اپنے دل کی بے بسی کا ذکر کیا ہے کہ یہ تو معلوم ہے محبوب سے محبت کا حصول ممکن نہیں لیکن پھر بھی دل اسے چاہنے سے باز نہیں آرہا۔ میں دل کے ہاتھوں بے بس ہوں۔ دوسری طرف اس میں اخلاص کا پہلو بھی ہے کہ محبوب کی بے رخی کے باوجود ہم اس سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔

شعر 6

کاروبار جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بے خودی سے ملتا ہے

مفہوم:

عقل کے ساتھ جب جنون شامل ہو جائے تو زندگی کے معاملات سنورتے ہیں۔

تشریح:

جگر مراد آبادی کا شمار سر کردہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی جگر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور قلبی کیفیات کے عکاس بھی۔

تشریح طلب شعر میں وہ کامرانی کے حصول کے باریک نکتے اور آفاقی سچائی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی کا کوئی شعبہ ہی کیوں نہ ہو، عشق ہو یا معاملاتِ زمانہ، ہوش کے ساتھ بے خودی ملے تو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھیے زندگی کیا چیز ہے

ہوش و خرد سے منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور منزل کا تعین کیا جاتا ہے جبکہ جذبہ، ولولہ اور منزل کے حصول کی بے خودی حرکت و جدوجہد کی لیے مائل کرتی ہے۔ جذبہ محرکہ محنت و مشقت کا باعث بنتا ہے۔ جب ہوش اور بے خودی مل جائیں تو منزل مقصود تک رسائی یقینی ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ خدا کی خوشنودی بھی بے انتہا لگن یا عشق لا محدود کی بے خودی کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ یہ نہ ہو تو عبادت میں حسن پیدا نہیں ہوتا۔

تیرا شوق اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عشق لا محدود کی بے خودی ہو تو پتھر کو موتی کی چمک عطا ہوتی ہے۔ تاج محل منصہ شہود پہ آتا ہے۔ آتش نمرود میں انسان کو دپڑتا ہے اور زمانے سے ٹکرا کر اپنا مطلوب حاصل کر لیتا ہے۔ غم روزگار ہو تو ہوش و جذبہ مل کر اس معاملے کو سنوار دیتے ہیں اور غم محبت ہو تو یہ آگ کا دریا پار کروا دیتے ہیں۔ خون جگر کے بغیر سب نقش نا تمام ہیں اور سب نغمے بے کیف ہیں۔ یوں زندگی کے سارے کاروبار اور سارے معاملات ہوش کے ساتھ بے خود کر دینے والے جذبے کے مرہونِ منت ہیں۔

شعر 7

روح کو بھی مزا محبت کا
دل کی ہمسائیگی سے ملتا ہے

مفہوم:

روح بھی محبت کا کیف تبھی حاصل کر پاتی ہے جب اسے محبوب اور محبت سے مزین دل کا قرب حاصل ہو۔

تشریح:

جگر مراد آبادی کا شمار سرکردہ غزل گو شعرا میں ہوتا ہے غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی جگر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور قلبی کیفیات کے عکاس بھی۔

تشریح طلب شعر میں جگر کہتے ہیں کہ روح کو بھی الفت و محبت کا سرور و کیف تبھی حاصل ہوتا ہے جب اسے محبوب کے حسن و عشق سے لبریز دل کا قرب اور ہمسائیگی حاصل ہو۔ شرط یہ ہے کہ دل کا موسم ٹھیک ہو غم کے بادل نہ چھائے ہوئے ہوں کوئی تلخ یاد یا چبھتی بات دل میں نہ ہو۔ دل مطمئن و مسرور ہو تو روح بھی قرار پائے گی۔ حدیث پاکؐ ہے۔

"جسم میں ایک خون کا لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست ہوتا ہے جب وہ درست نہ ہو تو سارا جسم خراب ہوتا ہے"۔ انسانی جسم خاکی وجود اور ابدی روح سے عبارت ہے۔ روح کے تمام کیف اور آزار جسمانی عمل کا نتیجہ ہیں۔ جسم وہی کرتا ہے جو اس کا مختار دل چاہتا ہے۔ مسرور ہونے کے لیے ضروری ہے کہ امنگیں اور خواہشیں تشنہ نہ ہوں۔ محبوب کی محبت نصیب ہو۔ دل باغ باغ ہو۔ دل میں گلہائے رنگا رنگ کھلے ہوں، بہار اپنے جوبن پر ہو تو روح مسرور و شادمان ہو گی۔ اگر دل میں ویرانی ہو تو روح تو روح ہے باہر بھی عین بہار میں خزاں محسوس ہوتی ہے۔

دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

دل مرکز محبت بھی ہے اور روگ و سوگ کا مقام بھی۔ دل جذب و شوق کی آماجگاہ بھی ہے اور آہ و بکا کی جگہ بھی۔ یہ حاکم بھی ہے اور مجبور بھی۔ روح و جسم تو اس سے ہم آہنگ رہتے ہیں اس کے سب موسموں کا ساتھی رہتے ہیں۔ دل روئے تو ساتھ روتے ہیں دل ہنسے تو ساتھ شادمان ہوتے ہیں۔ دل کی شادمانی ہے محبت، کامیاب محبت نہ کہ عشق لاحاصل۔ محبت کی کامیابی محبوب کی مرہونِ منت ہے اور دل کی رونق محبوب کے دم قدم سے ہے جب اس کو دیکھنا ہو دل میں جھانکو روح کو مسرور و شادماں کر لو۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

23 ۔ سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں

فراقؔ گورکھپوری

شعر1

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

مفہوم:

سر میں عشق کا زور نہیں دل میں خواہش نہیں لیکن معلوم نہیں ہم کب تک اس ترکِ محبت پر قائم رہیں گے۔

تشریح:

فراقؔ گورکھپوری مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں اور آفاقی موضوعات پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی الجھنوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملات محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فراقؔ دلی الجھن کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ذہن میں عشق کا خبط اور محبت کی دھن کی لگن نہیں ہے اور دل میں پیار کی امنگ اور محبوب کی محبت کی خواہش موجود نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تارکِ محبت ہو کر اس پر قائم بھی رہیں گے۔ دل کبھی ترک محبت کے بہانے مانگتا ہے اور پھر یہی دل کسی اور وقت پر ترک محبت کے ارادے کو ترک کر دیتا ہے اور جھٹلائے ہوئے سے ملنے کے بہانے مانگتا ہے۔ دل کا موسم پل بھر میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ جس کے بغیر جی نہ سکتا ہو اس کے بارے میں ہی نیتِ شوق بھر جاتی ہے۔ پھر کبھی اتنی گھٹن بڑھ جاتی ہے کہ دل تعلق دوبارہ استوار کرنا چاہتا ہے۔ شاعر فراقؔ اسی کیفیت سے دوچار ہیں کہ محبوب کی بے اعتنائی اور بے رخی نے دل کو بیزار کر دیا۔ رسوائی اور بے چینی کے سوا کچھ نہ ملا۔ ہزاروں تمنائیں اپنی موت آپ مر گئیں اور ہزاروں خواب ریزہ ریزہ ہو گئے لیکن محبوب کے من میں ہم محبت کی جوت نہ جگا سکے۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا (مومنؔ)

شاعر کہتا ہے کہ ہم ناکام و نامراد ٹھہرے، اپنی بد قسمتی پر آبدیدہ رہے اور بالآخر طے کر لیا کہ اب اس سے محبت نہیں کرنی۔ اب شاعر دل کی نازک کیفیت کو بیان کر رہا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے اس قول پر قائم بھی رہیں۔ ہماری کیفیت یوں بھی ہو سکتی ہے۔

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی (ناصرؔ کاظمی)

الطاف حسین حالیؔ نے اسی مفہوم کو اپنے خاص اسلوب میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں (حالیؔ)

شعر2

اک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

مفہوم:

ایک مدت سے تیری یاد نہیں آئی لیکن ایسا نہیں کہ ہم نے تجھے بھلا دیا ہے۔

تشریح:

فراقؔ گورکھپوری مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں اور آفاقی موضوعات پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی الجھنوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملات محبت کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں فراقؔ نکتہ آفرینی سے اپنی دلی کیفیت عیاں کر رہے ہیں کہ امنگوں کا مرکز و محور محبوب جب دل میں بس جائے تو اس گھر کا ایسا مکیں بن جاتا ہے کہ یہاں سے جاتا نہیں۔ اگر بالفرض چلا جائے تو ہر کونے سے اس کی خوشبو اس کی یاد دلاتی ہے۔ فراقؔ کہتے ہیں کہ اک عرصہ ہو گیا ہم نے تمہیں یاد نہیں کیا۔ جب کوئی محبت کی قدر نہ کرے تو اسے بھول جانا اچھا ہوتا ہے۔ ہم نے بھلانے کی کوشش کی اور تمہاری یاد اور خیال کی پناہ نہیں لی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم محبوب کو بھول گئے ہوں۔ محبوب کی یاد کا سہارا تو نہیں لیا لیکن محبوب کا نقش ضرور دل میں موجود رہا۔ یوں اسے یاد تو نہیں کرتے لیکن ہم اسے بھولے نہیں۔

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

محبوب کی یاد سکون اور گل فشانی کا سبب ہے۔ خیال یار کی تو چادر اوڑھ کر لوگ کڑی دھوپ کا سفر کاٹتے ہیں۔ یہ تو ویرانوں میں بہار کی مانند ہے۔

لیکن اگر شاعر اسے یاد نہیں کرتا تو اس کا باعث وہ تلخی حالات ہیں جو محبوب کے پیدا کردہ ہیں، وہ محبت کا قدر دان نہیں اور بے رخی و بے اعتنائی برتتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے اسی لیے اس کی یادوں سے کبھی دل کو بے چین کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن یہ دل خانہ خراب چیز ہی ایسی ہے جسے اپنے اندر جگہ دے اسے بھولتا نہیں۔ اسی لیے شاعر کہتے ہیں کہ محبوب کے رویے کے سبب ہم اسے یاد نہیں کرتے لیکن اسے بھول گئے اور اس کی یاد نہ آتی ہو، کوئی کسک اس نے نہ پیدا کی ہو ایسی بھی بات نہیں۔ اسے یاد تو نہیں کیا لیکن وہ کمبخت بھولتا نہیں۔

باغوں میں پڑے جھولے
تم ہمیں بھول گئے، ہم تم کو نہیں بھولے

شعر کے حقیقی معنوں میں فراقؔ نے کہا کہ ہم اپنے معبود کو بھولے نہیں۔ یہ روز مرہ کی مصروفیات ہیں اور انسانی لغزشیں ہیں جو ہم معبود کی طرف رجوع نہ کر سکے۔ اس کی عبادت و ریاضت میں مصروف نہ ہو سکے اور اسے یاد نہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم معبود کو بھول گئے ہوں اور اس پر اعتقاد کمزور پڑ گیا ہو اس کو نظر انداز کیا ہو۔ اس طوفانی دور میں گردش زمانہ کے سبب ہم دنیوی زندگی کے معاملات میں کھو ضرور گئے تھے لیکن خدا اب بھی ہمیں یاد ہے۔

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں

لیکن ٹلانہ ہرگز دل سے خیال تیرا

شعر 3

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانہ عشق

مگر اے دوست، کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

مفہوم:

یوں تو اہلِ عشق حدِ ادب میں رہتے ہیں اور ہنگامہ برپا نہیں کرتے لیکن جب ان کی راہ بند کی جائے تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

تشریح:

فراؔق گورکھپوری مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں اور آفاقی موضوعات پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی الجھنوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملات محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فراؔق اہل عشق کی حالتِ جنوں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق کے دیوانے ہنگامے برپا نہیں کرتے۔ جن کے دلوں میں سچا پیار موجود ہو وہ نہ تو رسوائی اور بدنامی کا باعث بنتے ہیں اور نہ ہی حدود و قیود کو توڑتے ہیں لیکن میرے دوستو ایسے لوگوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان کی آشفتہ سری نہ جانے کیا کچھ کر کے رکھ دے۔ انہیں قید کریں یا پہرے بٹھائیں ان کے دل کا ہنگامہ اور ذہن کی طوفانی کیفیت کبھی درست نہیں ہوتی۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی

اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا (میرؔ)

عشق بے انتہا لگن کا نام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں سارے کارنامے ہی عشق کے مرہونِ منت ہیں۔ عشق کبھی آگ میں ابراہیم کی مانند بے خطر کود پڑتا ہے تو کبھی کوہکنی پر اتر آتا ہے۔ اہل عشق ہنگامہ پرور نہیں ہوتے۔ لیکن حالات انہیں اس رخ پہ لے آتے ہیں کہ وہ کوئی انوکھا قدم اٹھائیں یا کچھ منفرد کام کر جائیں جس سے معاشرے کے جامد پانی میں ہلچل پیدا ہو جائے۔ تلخیٔ حالات اور ظلمِ محبوب عشق کے دیوانوں کا شب و روز کا چین چھین لیتا ہے اور وہ دن رات آہ وفغاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

شامِ الم ڈھلی اور چلی درد کی ہوا

رات کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو (منیرؔ نیازی)

انسانی رویے خارجی حالات سے پیدا کردہ داخلی کیفیات سے عبارت ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ اہلِ عشق صابر و شاکر ہوتے ہیں۔ وہ غمِ عشق اور غمِ زمانہ کو برداشت کرتے ہوئے غم کے سہنے میں بھی کیف محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جب حالات برداشت سے باہر ہو جائیں، طوفان پیدا ہو جائیں جس سے دلِ عاشقاں میں تلاطم پیدا ہو جائے تو پھر یہ اہلِ عشق کچھ انوکھا کر سکتے ہیں۔

شعر 4

آج غفلت بھی ہے ان آنکھوں میں پہلے سے سوا
آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

مفہوم:

آج ان کی آنکھوں میں پہلے سے زیادہ بے اعتنائی ہے۔ افسوس آج ہی اسے میرے صبر و قرار کا باعث نہیں بننا تھا۔

تشریح:

فراق گورکھپوری مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں اور آفاقی موضوعات پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی الجھنوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملات محبت کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں فراق کہتے ہیں کہ آج میرے محبوب کی آنکھوں میں غفلت، لاپرواہی اور بے رخی پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ یوں تو میرے محبوب نے کبھی توجہ بھری نظر سے میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کے دل میں میرے لئے کوئی پیار کی لہر پیدا نہیں ہو سکی۔ وہ پہلے بھی بے رخی سے ہی پیش آتا تھا لیکن آج اس نے کمال کر دیا ہے، حد کر دی ہے۔ غفلت اور بے رخی اوجِ ثریا پر ہے۔ دوسری طرف میرا دل بھی آج زیادہ مضطرب ہے۔ پہلے یہ محبوب کے نارواسلوک کو برداشت کر لیتا تھا آج اسے صبر نہیں آ رہا۔ پہلے رو دو کے چپ ہو جاتا تھا۔ اچھے وقت کی امید میں صابر ہو جاتا تھا۔ دل یہ یقین رکھتا تھا کہ ایسی کوئی رات نہیں جس کی سحر نہ ہو اور پتھر پر بھی اگر پانی کے قطرے لگاتار پڑتے رہیں تو اس میں چھید کر دیتے ہیں۔ محبوب چاہے بلا کا غافل ہو کسی دن اس کے من میں میرا پیار ضرور کروٹ لے گا۔ لیکن آج ایک طرف تو دل پہلے ہی بے چین و بے قرار تھا دوسری طرف محبوب کا رویہ بھی زیادہ ہی غیر مناسب ہو گیا ہے اسی لیے اس بیمار اور پریشان دل کو قرار نہیں آ رہا۔

شعر 5

رنگ وہ فصل خزاں میں ہے کہ جس سے بڑھ کر
شانِ رنگینی حسن چمن آرا بھی نہیں

مفہوم:

پت جھڑ کے موسم میں وہ رنگ و آہنگ ہے کہ موسم بہار کے گل و گلزار میں یہ شان پیدا نہیں ہو سکتی۔

تشریح:

فراق گورکھپوری مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں اور آفاقی موضوعات پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی الجھنوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملات محبت کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں فراق گورکھپوری تمثیلی انداز میں اپنی پر درد زندگی پر قانع ہو کر کہتے ہیں کہ پت جھڑ کا موسم رنگ و بو اور ہریالی کا خاتم ہے۔ بہار کی رنگینیوں کے لیے موت ہے۔ لیکن فراق کہتے ہیں کہ موسم خزاں کے مظاہر میں وہ حسن اور سکون ہے جو رنگ و بو سے پُر نور چمنستان کی خوبصورتی میں بھی نہیں۔ جب حالات سنورنے اور دل کا باغ کھلنے کی آس ختم ہو جائے تو خوابِ بہار سے دل کو فریب نہیں دینا چاہیے کہ حقیقت پرستی کے خلاف ہے۔ اس طرح جب خوابوں سے نکل کر حقیقت پر نظر پڑتی ہے تو تکلیف سے دل و دماغ میں سوگ کا سماں ہوتا ہے۔ اس لیے تلخیٔ

حالات اور مشکل زندگی کی حقیقت کو قبول کر لینا چاہیے۔ اس خرابے میں مطمئن ہو کر جو کیف ملتا ہے وہ خیالوں کی رنگین زندگی میں نہیں ملتا۔ بقول ساحرؔ

ہم کو ان سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو

ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے (ساحرؔ لدھیانوی)

بہار آتی ہے تو رنگ و بو کا قافلہ اتر پڑتا ہے اور دل کے جذبات اس رومان انگیز موسم میں دوآتشہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب محبوب کی غفلت اور بے رخی اور غم زمانہ سے واسطہ پڑتا ہے تو یہی جذبات رقت انگیزی میں بدل جاتے ہیں۔ یوں بہار کا موسم جو رومان انگیزی کا باعث بنا تھا اب الم انگیز ہو جاتا ہے بلکہ جب جب بہار کا موسم آتا ہے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے ہیں۔

مجھے شادابیٔ صحن چمن سے خوف آتا ہے

یہی وہ انداز تھے جن سے لٹی تھی زندگی میری

فراقؔ کہتے ہیں کہ اس لیے بہتر ہے انسان موسم خزاں اور اپنی درد بھری اجڑی زندگی پر قناعت کر لے۔ ناکامیوں اور دکھوں کا کرب پھر بے چین نہیں کرے گا۔

تیسرے زاویے سے دیکھا جائے تو اداس لوگوں کو شام کا وقت، غروبِ آفتاب کا منظر، پت جھڑ کا موسم، پیلے پتے، ٹنڈ منڈ شاخیں، ویران راستے، تاریک راہیں، کمرے کی تنہائی، پُر درد شاعری اور کھنڈرات اور بے آباد پہاڑی علاقے بہت پسند آتے ہیں۔ فراقؔ بھی غم عشق اور غم زمانہ کے ستائے ہوئے ہیں انہیں بھی اسی لیے پت جھڑ کے موسم کے مظاہر فصل بہار کی رنگینی سے زیادہ بھلے لگ رہے ہیں کہ وہ در حقیقت اندر سے اداس ہیں۔

چوتھا زاویہ یہ ہے کہ حق پرست لوگوں کو راہِ راست میں مصائب کے پہاڑوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن اگر عزم راسخ ہو تو وہ گھبراتے نہیں۔ بلکہ اپنے تلخ حالات کو زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں اور مشکلات سے لڑتے رہتے ہیں۔ اپنے غموں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ فراقؔ نے بھی یہی کیا کہ دکھ اور غم کی حقیقت بھری زندگی کو قبول کر لیا ہے۔

شعر 6

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام

کنجِ زنداں بھی نہیں وسعتِ صحرا بھی نہیں

مفہوم:

بے چین دل کا مقام نہ گوشہ تنہائی میں ہے اور نہ ہی وسعت صحرا میں ہے۔

تشریح:

فراقؔ گورکھپوری مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں اور آفاقی موضوعات پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی الجھنوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملات محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فراقؔ دل کی بے چینی کو کسی طور قرار نہ آنے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے چین دل کو سکون پذیر کرنے کے لئے عشّاق کو مقید کر دیا جاتا ہے تو کبھی یہی عشاق صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں اور قرار تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن دراصل بات یہ ہے کہ بے قرار دل کی وحشت کو نہ تو قید خانے کی تنہائی، پابندی اور سختی سکون پذیر کر سکتی ہے اور نہ ریگستانوں کی تنہائی اور ویرانی اس وحشت کو ختم کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ

ہے کہ اندر کا موسم شدید خراب ہو تو دل میں وحشت و مجنونیت جنم لیتی ہے اور اسے قرار اس کی وجوہات ختم کرنے سے ہی آسکتا ہے۔ اگر غم عشق ہو تو محبوب کا قرب، وصل اور اگر غم زمانہ ہو تو مسائل کا حل ہی تسکین دے سکتا ہے اور وحشت کو قرار میں بدل سکتا ہے۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی

شعر میں حقیقی مفہوم پیش کیا گیا ہے کہ سکون و قرار کی تلاش تو ہر شخص کو ہے لیکن اسے غیر موزوں جگہوں پر تلاش کیا جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی شے دائمی سکون سے بہرہ ور نہیں کر سکتی۔ اپنے معبود کا قرب، اس سے محبت، اسی کی خوشنودی کا حصول اور عبادت سے ہی حقیقی سکون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقی سکون نہ تو رہبانیت میں ہے کہ فقرِ خانقاہی اختیار کیا جائے اور نہ ہی جنگلوں، ریگزاروں کی تنہائی میں عبادت کرنے سے ملتا ہے۔ صرف ایک ہی طریقے سے ابدی سکون ممکن ہے کہ اصلی روح کے مطابق معبود کی تابع فرمانی کی جائے جس سے موجودہ زندگی بن سکے اور آنے والی زندگی سنور سکے۔ مذہبی پیشواؤں کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے۔

شعر 7

ہم اسے منھ سے برا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
دوست تیرا ہے، مگر آدمی اچھا بھی نہیں

مفہوم:

فراقؔ! ہم اسے منہ سے برا نہیں کہتے کہ وہ تیرا دوست ہے لیکن وہ آدمی اچھا نہیں۔

تشریح:

فراقؔ گورکھپوری مشہور غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں اور آفاقی موضوعات پر مبنی ان کے اشعار زندگی کی الجھنوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملات محبت کے عکاس بھی۔

ہم فراقؔ کو دل سے اچھا نہیں سمجھتے لیکن اسے منہ سے برا نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اے محبوب وہ تیرا دوست ہے اور تجھ سے وابستہ ہر چیز تحسین آمیز ہے۔ فراقؔ نے اس شعر میں محبوب کی قدر و قیمت اور اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ وہ عام اشیاء جو محبوب سے متعلقہ ہوں خاص ہو جاتی ہیں۔ پری وش سے محبت کر کے گمنام فرد مشہور عاشق زار بن جاتا ہے۔ جب محبت خالص ہو تو محبوب اور اُس سے وابستہ فرد و اشیا محترم ہو جاتی ہیں۔ ان کے نقائص محسوس نہیں ہوتے۔ شاعر فراقؔ یہی نکتہ بیان کر رہے ہیں کہ فراقؔ بندہ بشر ہے، خطا کا پُتلا، عاشق زار ہے اور خامیوں کا منبع ہے لیکن ہم اسے منہ سے برا نہیں کہہ سکتے کیونکہ تمہارا دوست ہے تمہارا چاہنے والا ہے اور تم اس کی پہچان ہو۔

اس شعر میں حقیقی مفہوم بھی پیش کیا گیا ہے کہ فراقؔ بندہ ہو کر بندگی سے غافل ہے اس لیے اچھا بندہ نہیں۔ لیکن ہم اسے منہ سے برا نہیں کہتے کیونکہ آخر وہ اے معبود تیرا بندہ ہے تیرا چاہنے والا ہے۔ تجھ سے دوستی کے سبب ہماری زبانیں بند ہیں کہ جب تجھ سے نسبت ہے تو ہمیں کچھ کہنے کا حق نہیں۔ اس لیے ہم اسے منہ سے برا نہیں کہتے۔

24 ۔ یہ فخر تو حاصل ہے، بُرے ہیں کہ بھلے ہیں

ادا جعفری

شعر1

یہ فخر تو حاصل ہے، بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
دو چار قدم ہم بھی، تیرے ساتھ چلے ہیں

مفہوم:

ہم بُرے ہیں یا بھلے۔ ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ کچھ عرصہ محبوب کی رفاقت نصیب رہی۔

تشریح:

ادا جعفری معروف غزل گو شاعرہ ہیں۔ وہ جدید لہجے میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو منظوم کرتی ہیں۔ شاعرہ کو اپنے محبوب کے ساتھ چند قدم چلنے پر فخر ہے۔

اُردو شاعری کی ایک عجیب سی روایت ہے جس میں محبوب کو انتہائی اونچا مقام حاصل ہے۔ یہ ایسی ہستی ہے جو خود کو ہر عیب سے بری قرار دیتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے پر اس کے چاہنے والوں کا نہ کوئی مقام ہے، نہ شناخت ہے، نہ کوئی عزت و آبرو ہے۔ شاعرہ نے محبوب کے مقابلے پر خود کو بہت ہی کم تر حیثیت میں پیش کیا ہے۔ اور اُس کی تمام تر کوتاہیوں کو اپنی ذات سے وابستہ کر کے اُسے ہر قسم کی خطا اور جرم سے مبرّا قرار دے دیا ہے اگر محبوب بے وفائی کرے تو روا، ظلم کرے تو جائز، بے اعتنائی برتے تو درست بس کبھی کبھار چاہنے والوں کی طرف نظرِ کرم کرے تو، تو یہ اُن کے لیے بہت بڑا اعزاز، انعام اور عزت افزائی ہے۔

شاعرہ کو اپنی کم مائیگی اور اپنے محبوب کے بلند مقام کا احساس ہے۔ وہ کھلے لفظوں میں تسلیم کرتی ہے کہ اس زمانے میں اس کی اہمیت نہیں ہے، چاہے اسے کوئی جانتا ہے یا نہیں اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اسے صرف فخر اس بات پر ہے کہ اس نے محبوب کے ساتھ چند گھڑیاں گزاری ہیں۔ اس کی ساری زندگی کا حاصل اور قیمتی سرمایہ وہی لمحات ہیں جو اس نے محبوب کے ساتھ گزارے ہیں۔

حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ کسی نے مٹی سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تجھ سے خوشبو آرہی ہے؟ وہ بولی میں ناچیز مٹی ہوں، لیکن کچھ عرصہ مجھے پھول سے ہم نشینی یعنی محبت کا موقع ملا۔ اس محبت کا رنگ چڑھ گیا ہے ورنہ میں تو مٹی ہوں۔

شاعرہ کہتی ہے کہ اگرچہ میری ذات پہ نکتہ چینی کی گئی ہے، مجھے بہت بُرا بھلا کہا گیا کہ میں اس کے معیار کی نہیں ہوں۔ میرا سماجی مقام اس کا سا نہیں۔ میرا طبعی مزاج اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میں جاذبیت کے خواص نہیں رکھتی وغیرہ۔ ان باتوں سے قطع نظر کہ میں کیا ہوں۔ بری ہوں یا بھلی ہوں۔ مجھے تو اس بات پہ فخر ہے کہ مجھے اس کا ساتھ نصیب رہا۔ محبت ہے ہی لا حاصل۔ لوگ تو محبوب کی نظرِ کرم کو ترستے ہیں۔ محبت حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ محبوب ان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔ میں تو خوش نصیب ہوں جسے محبوب کا ساتھ کچھ مدّت حاصل رہا ہے۔ یہ عرصہ میرا سرمایہ حیات ہے۔ وہ ہمیشہ نہ سہی کچھ عرصہ تو میرے ساتھ رہا ہے۔ بقول شاعر

ہماری تو ایک زندگی تھی تمہارے نام کر دی

تمہاری یہ ضد ہے کہ تمہارے معیار کا کوئی نہیں

شعر 2

جلنا تو چراغوں کا مقدر ہے ازل سے

یہ دل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں

مفہوم:

چراغوں کے مقدر میں تو ازل سے جلنا لکھا ہے لیکن میرے دل کے کنول نہ بجھتے ہیں نہ جلتے ہیں۔

تشریح:

ادا جعفری معروف غزل گو شاعرہ ہیں۔ وہ جدید لہجے میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو منظوم کرتی ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں وہ کہتی ہیں کہ روزِ اول سے چراغوں کے مقدر میں جلنا لکھ دیا گیا ہے مگر دل کے کنول نہ جلتے ہیں اور نہ بجھتے ہیں۔

جلنا تو چراغوں کا مقدر ہے، اس سے دو مفہوم ملتے ہیں ایک یہ کہ میرے دل کو کسی پل چین اور سکون نہیں ملتا۔ دوسرا میرا دل نہ تو آرزوؤں سے بیگانہ ہو کر بجھتا ہے یعنی بے جان ہوتا ہے اور نہ ہی آرزوؤں کے مکمل ہونے کی وجہ سے جل کر راکھ ہوتا ہے یعنی ہر وقت سلگتا رہتا ہے یعنی خواہشات پوری بھی نہیں ہوتیں اور ختم بھی نہیں ہوتیں۔

رہنے دو کہ اب تم بھی مجھے پڑھ نہ سکو گے

برسات میں کاغذ کی طرح بھیگ گیا ہوں

اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ دل ایک چراغ کی مانند ہے اور روزِ اوّل سے اس کی تخلیق کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس چراغ میں عشق حقیقی کا شعلہ جلتا رہے لیکن میرے دل کا چراغ نہ جلتا ہے نہ بجھتا ہے یعنی عشق حقیقی کا شعلہ غمِ روزگار کی وجہ سے نہ روشن ہوتا ہے اور نہ فطری رغبت اسے بجھنے دیتی ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان دونوں صورتوں میں سے کسی بھی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوتے۔ ایسی ہی صورت میں اس شعر کے مطابق ہماری شاعرہ بھی نظر آ رہی ہے۔ اُس کے خیال میں چراغوں کی قسمت میں تو ابتداء ہی سے جلنا لکھا ہے اور وہ جلتے ہیں خواہ کسی بے بس کی شمع مزار بن کر جلیں یا کسی رئیس کے گھر میں خوبصورت فانوسوں کی شکل میں نور افشانی کریں دل کے چراغ تو اس قسم کی کسی صورت حال سے عہدہ برآ نہیں ہوتے، ان پر جلنے بجھنے کی منزل نہیں آ سکی۔

شعر 3

نازک تھے کہیں رنگِ گل و بوئے سمن سے

جذبات کہ آداب کے سانچے میں ڈھلے ہیں

مفہوم:

میرے جذبات پھولوں سے زیادہ نازک و حسین ہیں لیکن یہ حدِ ادب کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔

تشریح:

اداؔجعفری معروف غزل گو شاعرہ ہیں۔ وہ جدید لہجے میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو منظوم کرتی ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں اداؔجعفری عشق میں ادب واحترام کو روحِ جذبات قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ میرے جذبات میں پھولوں کی خوشبو، خوبصورتی اور نزاکت تھی۔ جیسے گلاب کے سُرخ پھول، خوش رنگ اور نازک محسوس ہوتے ہیں اور چنبیلی کی خوشبو بھینی بھینی اور معطر کر دینے والی ہوتی ہے اسی طرح میرے جذبات بھی نزاکت اور رعنائی رکھتے تھے۔ لیکن جب سے یہ آداب کے سانچے میں ڈھلے، انہیں اپنی حدود و قیود کا پتا چلا۔ اب یہ محدود ہو گئے ہیں۔ میرے جذبات بہت ہی نرم نازک ہیں لیکن ان کی حد ہے، ادب کی حد۔ اسی حد کے پابند ہو کر ان میں توازن پیدا ہو گیا ہے اور دراصل ان کی نزاکت اور بڑھ گئی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

شاعرہ کہتی ہے کہ ہم بھی محبت کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ہمارے جذبات گُلوں کی خوبصورتی و رعنائی اور چنبیلی کی خوشبو کی مانند پذیرائی کے خواص رکھتے ہیں۔ جوشِ محبت، سوزِ دروں اگر آشکار ہو جائے تو زمانے بھر میں پذیرائی حاصل کرے لیکن ہمیں پتا ہے کہ ہر کام کے آداب کیا ہیں۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی رسوائی نہیں چاہتا۔ اس کو سرِ محفل ہدفِ تنقید بنانے کا موقع نہیں دیتا۔ اسی لیے ہم نے اپنے جذبات کو حدِ ادب سے باہر نہیں نکلنے دیا بلکہ انہیں شائستگی اور آداب کے دائرے میں رکھا ہے۔

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوہ عشق نہیں حسن کو رُسوا کرنا

شعر 4

تھے کتنے ستارے کہ سرِ شام ہی ڈوبے
ہنگامِ سحر کتنے ہی خورشید ڈھلے ہیں

مفہوم:

ستاروں جیسے بہت سے لوگ آغاز زندگی میں ہی فوت ہو گئے، بہت سے سورج جیسے لوگ دمِ صبح ہی عدم کو چلے گئے۔

تشریح:

اداؔجعفری معروف غزل گو شاعرہ ہیں۔ وہ جدید لہجے میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو منظوم کرتی ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں وہ کہتی ہیں کہ آسمان کے دامن میں بے شمار ستارے ایسے ہوتے ہیں جنہیں چمکنا نصیب نہیں ہوتا اور وہ شام ہوتے ہی ڈوب جاتے ہیں اور اسی طرح کئی سورج صبح ہوتے ہی ڈھل جاتے ہیں۔ یہ دنیا فانی اور موت برحق ہے۔ موت نہایت ظالم اور بے رحم ہے۔ وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ کتنے ستارے ایسے ہیں جنہوں نے اپنی پوری آب و تاب سے چمکنا تھا۔ اس دنیا کی خوبصورتی سے لطف اٹھانا تھا۔ مگر وہ محروم رہ گئے موت کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ

ترجمہ: "ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے"۔

اسی طرح سورج جس نے تمام دنیا کو منوّر کرنا تھا صبح کے وقت ہی ڈھل گیا۔

زندگی کا بھروسا ہی کیا اک چھلکتا ہوا جام ہے

زندگی! زندگی! زندگی! موت کا دوسرا نام ہے

اس شعر کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ وقت نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ بہت سے ایسے بچے جنہوں نے دنیا کی خوبصورتی اور رونق سے لطف اٹھانا تھا کم عمری میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور بہت سے جوان جنہوں نے ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالنی تھی انہیں بھی موت نے مہلت نہ دی۔

حیات عجب مرحلہ بے ثبات ہے

ہر اک ذی روح کو آخر ممات ہے

شاعرہ کہہ رہی ہے کہ ایسے کتنے ہی ستارے تھے جو اپنی روشنی پھیلانے سے قبل ہی ڈوب گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریکی بڑھ گئی اور اس گہری تاریکی سے سحر کے وقت کتنے سورج اپنی پوری آب وتاب سے طلوع ہوئے۔ قاعدہ ہے کہ رات جتنی زیادہ گہری اور تاریک ہو گی، سورج کی روشنی اس قدر چمکدار اور تابناک ہو گی۔ لہٰذا وہ ستارے جو شام کے وقت ہی ڈوب گئے ان کے غروب ہونے سے کئی سورج نکلے اور ہر سو روشنی پھیل گئی۔

شعر 5

جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور

تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ لوگ جلے ہیں

مفہوم:

جنہوں نے کڑا وقت ہنس کر جھیل لیا تھا اور اسے اچھے وقت میں بدل دیا تھا۔ جب اچھا وقت آیا تو ان کی قسمت میں جلنا کڑھنا لکھا تھا۔

تشریح:

ادا جعفری معروف غزل گو شاعرہ ہیں۔ وہ جدید لہجے میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو منظوم کرتی ہیں۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ کہتی ہیں کہ انسانی فطرت ہے کہ وہ غیروں کے ظلم وستم کو تو برداشت کر لیتا ہے لیکن اپنوں کی بے رُخی اسے مار دیتی ہے۔

اس شعر میں انسانی فطرت کی عکاسی کی گئی ہے کہ غیروں کا ظلم وستم انسان ہنس کر برداشت کر لیتا ہے لیکن اپنوں کی تھوڑی سی بے مروتی بھی اس کی جان لے لیتی ہے۔ یوں انسان کڑی دھوپ میں تو سفر کر سکتا ہے مگر ٹھنڈی چھاؤں میں سفر کرنا اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اسی طرح غیروں کے تیر اور تلوار بھی اتنا زخمی نہیں کر سکتے جو اپنوں کی زبان کر سکتی ہے۔

دنیا ہزار ظلم کرے اس کا غم نہیں

مارا جو تو نے پھول وہ پتھر سے کم نہیں

ادا جعفری محبوب کی بے مروتی اور بے وفائی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اہلِ وفا نے آزمائش کے ہر کڑے وقت میں وفا کی، ساتھ نبھایا اور مشکلات سے نکلنے میں پورا ساتھ دیا۔ مگر جب محبوب کو کامیابی و آسودگی نصیب ہوئی تو اس نے سب احسانات کو بھلا دیا۔ اُسے وفائیں یاد نہ رہیں۔ وہ نئے دور کا راہرو ہو گیا اور اُسے نئے دور کی ہوا لگ گئی۔ چنانچہ وہ اہلِ وفا جو ساتھ نبھانے میں ثابت قدم رہے اُن کی قسمت میں جلنا اور کُڑھنا رہ گیا۔

انہوں نے کڑی دھوپ کے تیور تو محبوب کی خاطر ہنس کر برداشت کیے تھے لیکن اب اس وفا کا صلہ رونے کے سوا کچھ نہیں۔

شاعرہ کہہ رہی ہے کہ وہ دلیر اور بہادر حوصلہ مند لوگ جنہوں نے زمانے کی تیز دھوپ کا مقابلہ بڑے حوصلے، عزم واستقلال سے کیا ٹھنڈی چھاؤں میں انہیں جلنے اور سُلگنے کا احساس ہوتا ہے۔

شعر6

اک شمع بجھائی تو کئی اور جلالیں

ہم گردش دوراں سے بڑی چال چلے ہیں

مفہوم:

اگر زمانہ ایک شمع بجھائے گا تو کئی اور جلالیں گے۔زمانہ بڑا چال باز ہے لیکن ہم اس سے زیادہ باہمت اور چالاک ہیں۔

تشریح:

ادا جعفری معروف غزل گو شاعرہ ہیں۔وہ جدید لہجے میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو منظوم کرتی ہیں۔ زیرِ تشریح شعر میں وہ کہتی ہیں کہ زمانے نے تو بہت کوشش کی کہ وہ ہمیں اندھیرے میں رکھے مگر ہم نے بھی چال چلی کہ اس نے ایک شمع چھین لی تو ہم نے دوسری جلالی۔

شاعروں کی نظر میں آسمان اور زمانے کی گردش ان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔زمانہ ظالم اور مکار ہے وہ ہمارے حوصلے پست کرنا چاہتا ہے۔

گردش دوراں ہمیں شکست دینا چاہتی ہے مگر ہم بھی بڑے چالاک ہیں ہم زمانے کی ہر چال کو سمجھتے ہیں۔زمانے نے اگر ہماری امید کی ایک شمع بجھائی تو ہم نے امید کی نئی شمع سینے میں روشن کی۔زمانے میں ہمارا ایک راستہ بند کیا تو ہم نے دوسرا راستہ تلاش کرلیا۔زمانہ ہمیں پریشانیوں اور مصائب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے لیکن ہم ہمت ہارنے والے نہیں۔ہم خوشی کی ہلکی سی رمق پا کر ہر غم بھول جاتے ہیں اور پھر سے نئے غم سہنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔کیونکہ غم سہنے میں بھی قدرت نے ایک مزہ رکھا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

زندگی میں دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔کامیابی اور ترقی کی طرف بڑھتے دیکھ کر دشمن تو جلتے ہی ہیں،اپنے بھی جلتے ہیں۔محبت ہو یا کوئی اور منزل،حاسد کامیابی ہضم نہیں کر پاتے۔چنانچہ طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔شاعرہ کہتی ہے کہ حاسدین لاکھ برا چاہیں ہم ان کے روکنے سے رکنے والے نہیں وہ اگر ایک راہ مسدود کریں گے ہم اور راستے تلاش کرلیں گے اور منزل تک پہنچ کر دم لیں گے۔پانی کی گزرگاہ تنگ کی جائے تو اس میں طغیانی آتی ہے۔زمانہ رکاوٹیں کھڑی کر کے ہماری جدوجہد کو مہمیز کرتا ہے۔وہ عیار ہے تو ہم اس سے زیادہ عیار ہیں۔وہ ایک طرف سے رکاوٹ ڈالے گا ہم کسی اور طرف سے مقصود حاصل کرلیں گے۔وہ ایک راہ کی شمع بجھا کر راستہ تاریک کرے گا ہم اور راہوں پر شمعیں جلا کر سفر جاری رکھیں گے۔حوصلوں اور جذبوں کو سازشوں سے شکست نہیں دی جاسکتی۔اے گردشِ دوراں! ہم ناقابل شکست ہیں!!

"ایک آدمی تباہ تو ہو سکتا ہے

لیکن اسے شکست نہیں دی جاسکتی"(ہیمنگوے)

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور (غالب)

27 ۔ بہادر بچے

ناصر بشیر

شعر نمبر 1

پاکستانی بچے ہیں ہم، امن سے اتنا پیار ہمیں
اپنے اندر کے دشمن سے لڑنا ہے اس بار ہمیں

مفہوم:

ہم پاکستانی بچے ہیں، امن سے پیار کرتے ہیں۔ اس بار امن کے لئے ہمیں اندرونی دشمن سے لڑنا ہے۔

تشریح:

شاعر ناصر بشیر نے اس شعر میں پاکستان میں جاری دہشت گردی کے پس منظر میں پاکستانی بچوں کے عزم و ہمت پہ روشنی ڈالی ہے۔ پاکستان کے بچے بلند ہمت اور بلند حوصلہ ہیں۔ جس طرح پاکستان کے لوگ یک دل یک جان جفاکش اور امن سے پیار کرنے والے ہیں۔ اسی طرح اس ملک کے بچے بھی انہی خصائص سے بہرہ ور ہیں۔ یہ تشدد اور منفی رویوں سے متنفر ہیں۔ دہشت اور جنگ کے ماحول کو کوئی بچہ بھی پسند نہیں کرتا۔ بچے پھول ہوتے ہیں۔ اور گل و گلزار کے ماحول کو پسند کرتے ہیں۔

بد قسمتی سے پاکستان میں 9/11 کے بعد کے اثرات کے باعث دہشت گردی کی تیز لہر جاری ہے۔ ہمارے اندر کے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی نے ہماری قومی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں کے مذہبی رجحانات میں بہت تضاد ہے۔ ان تضادات کو غیر ملکی ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں۔ اور پاکستان میں بدامنی پھیلا کر اسے غیر مستحکم کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ بھارت کی را اور افغانستان کی این ڈی ایس اس میں پیش پیش ہے۔ لیکن اہم امر یہ ہے کہ جب تک ہمارے اندر کے لوگ ان کے آلہ کار نہ بنیں یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے اندر کے لوگ اپنے فرقہ وارانہ مذہبی مقاصد کے لئے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ شب و روز یہاں دھماکے ہوتے ہیں۔ اب پاکستانی فوج نے آپریشن راہِ راست، راہِ نجات، ضرب عضب اور ردالفساد کے ذریعے اس جن کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔

ہمارے بچے اس قومی مقصد میں پیچھے نہیں ہیں۔ اے پی ایس کے بچے قربان ہوئے۔ اعتزاز احسن نے سکول بچانے کے لیے جان قربان کی۔ ہمارے تمام بچے اسی جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ ابھی بھی لڑ رہے ہیں اور بڑے ہو کر اندرونی خطرات سے کماحقہ نبرد آزما ہوں گے اور کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

خونِ دل دے کے نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

شعر نمبر 2

دریا میں طغیانی ہے، منجدھار میں کشتی ٹھہری ہے

لیکن ہم نے سوچ لیا ہے، جانا ہے اُس پار ہمیں

مفہوم:

اگرچہ پاکستان کے حالات دگرگوں ہیں لیکن ہم اسے امن و آشتی کا گہوارہ بنا کر دم لیں گے۔

تشریح:

شاعر ناصر بشیر پاکستان میں جاری دہشت گردی کی لہر کے پس منظر میں پاکستانی بچوں کے غیر متزلزل اور مصمم ارادوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ پاکستان کے حالات دگرگوں ہیں یہاں عسکریت پسندی اور انتہا پسندی ہے جو دہشت گردی کو جنم دے رہی ہے۔ ہمارے اندرونی دشمن ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ یہ ہمیں فوجی معاشرتی اور تعلیمی ہر لحاظ سے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی کشتی تیز منجدھار میں ہے لیکن یہ ہمارا مصمم ارادہ ہے کہ ہم ہر طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے دریا پار ضرور جائیں گے جہاں امن ہی امن ہو گا اور بدامنی و دہشت گردی کا نام و نشان بھی نہیں ہو گا۔

یہاں جو پھول کھلے، کھلا رہے صدیوں
خزاں کو یہاں سے گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

بدقسمتی سے پاکستان میں 9/11 کے بعد کے اثرات کے باعث دہشت گردی کی تیز لہر جاری ہے۔ ہمارے اندر کے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی نے ہماری قومی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں کے مذہبی رجحانات میں بہت تضاد ہے۔ ان تضادات کو غیر ملکی ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں۔ اور پاکستان میں بدامنی پھیلا کر اسے غیر مستحکم کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ بھارت کی را اور افغانستان کی این ڈی ایس اس میں پیش پیش ہے۔ لیکن اہم امر یہ ہے کہ جب تک ہمارے اندر کے لوگ ان کے آلہ کار نہ بنیں یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے اندر کے لوگ اپنے فرقہ وارانہ مذہبی مقاصد کے لئے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ شب و روز یہاں دھماکے ہوتے ہیں۔ اب پاکستانی فوج نے آپریشن راہِ راست، راہِ نجات، ضربِ عضب اور ردالفساد کے ذریعے اس جن کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔

ہمارے بچے اس قومی مقصد میں پیچھے نہیں ہیں۔ اے پی ایس کے بچے قربان ہوئے۔ اعتزاز احسن نے سکول بچانے کے لیے جان قربان کی۔ ہمارے تمام بچے اسی جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ ابھی بھی لڑ رہے ہیں اور بڑے ہو کر اندرونی خطرات سے کما حقہ نبرد آزما ہوں گے اور کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

شعر نمبر 3

کلیاں دل کی کھل جائیں گی، بادِ صبا اٹھلائے گی

فصلِ بہار ہے آنے والی، دکھتے ہیں آثار ہمیں

مفہوم:

پریشان دل خوش ہوں گے۔ دہشت گردی ختم ہو گی ہمیں آثار نظر آ رہے ہیں کہ پاکستان امن کا گہوارہ بنے گا۔

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ خزاں جانے والی ہے اور بہار کا قافلہ اترنے کو ہے۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر بور آئے گا۔ کونپلیں پھوٹیں گی۔ غنچے چٹخیں گی اور کئی کلیاں کھلیں گی۔ تمثیلی انداز میں مستقبل کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے کہ ملک میں خون آشام دہشت گردی کی لہر تھمنے کو ہے۔ راہِ راست، راہِ نجات، ضرب عضب اور ردالفساد کا اجر ملنے کو ہے۔ پریشان دل خوش ہو جائیں گے۔ ٹھنڈی ہوائیں ہوں گی۔ صبح جیسی پاکیزگی پورا سال یہاں رواں دواں اور حاوی رہے گی۔ ہمیں آثار نظر آ رہے ہیں کہ پاکستان امن کا گہوارہ بنے گا۔ بدامنی کا دور ختم ہو گا اب راوی چین ہی چین لکھے گا۔

خدا کرے میری ارض پاک پر اترے

وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

بد قسمتی سے پاکستان میں 9/11 کے بعد کے اثرات کے باعث دہشت گردی کی تیز لہر جاری ہے۔ ہمارے اندر کے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی نے ہماری قومی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں کے مذہبی رجحانات میں بہت تضاد ہے۔ ان تضادات کو غیر ملکی ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں۔ اور پاکستان میں بدامنی پھیلا کر اسے غیر مستحکم کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ بھارت کی را اور افغانستان کی این ڈی ایس اس میں پیش پیش ہے۔ لیکن اہم امر یہ ہے کہ جب تک ہمارے اندر کے لوگ ان کے آلہ کار نہ بنیں یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے اندر کے لوگ اپنے فرقہ وارانہ مذہبی مقاصد کے لئے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ شب و روز یہاں دھماکے ہوتے ہیں۔ اب پاکستانی فوج نے آپریشن راہِ راست، راہِ نجات، ضرب عضب اور ردالفساد کے ذریعے اس جن کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔

ہمارے بچے اس قومی مقصد میں پیچھے نہیں ہیں۔ اے پی ایس کے بچے قربان ہوئے۔ اعتزاز احسن نے سکول بچانے کے لیے جان قربان کی۔ ہمارے تمام بچے اسی جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ ابھی بھی لڑ رہے ہیں اور بڑے ہو کر اندرونی خطرات سے کماحقہ نبرد آزما ہوں گے اور کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

شعر نمبر 4

صحنِ چمن کی مٹی کو ہم اپنے خون سے سینچیں گے

اس کا اِک اِک صحرا آخر کرنا ہے گلزار ہمیں

مفہوم:

وطن کے صحن چمن کی مٹی کو اپنے لہو سے سیراب کر کے اس کا ایک ایک صحرا گلزار کر دیں گے۔

تشریح:

ناصر بشیر اس شعر میں ہماری نسلِ نو کے عزمِ صمیم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وطن میں جاری بدامنی اور دہشت گردی کی لہر کو ہم اپنے خون کا خراج دے کر امن و آشتی میں مل دیں گے۔ جو قریہ جو گوشہ بھی عسکریت پسندی اور دہشت گردی کے باعث بدامنی کا شکار ہے اسے امن کا گہوارہ بنائیں گے۔ علامتی انداز میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے بچے ہمارا مستقبل ہیں ملک کی خاطر جان دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے بلکہ ہر شعبے میں ملک سے پسماندگی کا خاتمہ کر دیں گے اور وطن کا چہرہ روشن کر دیں گے۔

خونِ دل دے کے نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب

ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

بدقسمتی سے پاکستان میں 9/11 کے بعد کے اثرات کے باعث دہشت گردی کی تیز لہر جاری ہے۔ ہمارے اندر کے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی نے ہماری قومی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں کے مذہبی رجحانات میں بہت تضاد ہے۔ ان تضادات کو غیر ملکی ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں۔ اور پاکستان میں بدامنی پھیلا کر اسے غیر مستحکم کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ بھارت کی را اور افغانستان کی این ڈی ایس اس میں پیش پیش ہے۔ لیکن اہم امر یہ ہے کہ جب تک ہمارے اندر کے لوگ ان کے آلہ کار نہ بنیں یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے اندر کے لوگ اپنے فرقہ وارانہ مذہبی مقاصد کے لئے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ شب و روز یہاں دھماکے ہوتے ہیں۔ اب پاکستانی فوج نے آپریشن راہِ راست، راہِ نجات، ضربِ عضب اور ردالفساد کے ذریعے اس جن کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔

ہمارے بچے اس قومی مقصد میں پیچھے نہیں ہیں۔ اے پی ایس کے بچے قربان ہوئے۔ اعتزاز احسن نے سکول بچانے کے لیے جان قربان کی۔ ہمارے تمام بچے اسی جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ ابھی بھی لڑ رہے ہیں اور بڑے ہو کر اندرونی خطرات سے کماحقہ نبرد آزما ہوں گے اور کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

شعر نمبر 5

ہم آنکھوں میں سپنے لے کر آگے بڑھتے جائیں گے
موت سے ہم کو ڈر نہیں لگتا، جینے سے ہے پیار ہمیں

مفہوم:

ہم رکیں گے نہیں۔ ہم خوابوں کی تعبیر کے لیے آگے سے آگے بڑھتے جائیں گے۔ مرنے سے ڈرتے نہیں لیکن اچھی زندگی سے بھی پیار ہے۔

تشریح:

شاعر ناصر بشیر نونہالانِ وطن کے عزم و ہمت اور بلند مقاصد کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بہادر بچے بلندیوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے یہ آگے بڑھیں گے۔ غاروں کے دور میں واپس نہیں جائیں گے جیسا کہ عسکریت پسند چاہتے ہیں۔ یہ شاندار زندگی، فقید المثال کردار، پرامن ملک، ترقی یافتہ طرزِ حیات، اعلٰی منصب اور عصرِ جدید کی بہترین تعلیم کے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیں گے۔ یہ راہِ خدا اور راہِ وطن میں مرنے سے ڈرتے نہیں۔ انہیں بلند مقاصد کے لئے مرنا آتا ہے اس لیے انہیں جینا آتا ہے۔ یہ اس زندگی کو بہترین بنانے کے لیے بھی تن من دھن نثار کر سکتے ہیں۔

شاعر جمع متکلم کے انداز میں بچوں کی آواز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم ان دہشتگردوں کے روکنے سے رکیں گے نہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے۔

بدقسمتی سے پاکستان میں 9/11 کے بعد کے اثرات کے باعث دہشت گردی کی تیز لہر جاری ہے۔ ہمارے اندر کے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی نے ہماری قومی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں کے مذہبی رجحانات میں بہت تضاد ہے۔ ان تضادات کو غیر ملکی ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں۔ اور پاکستان میں بدامنی پھیلا کر اسے غیر مستحکم کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ بھارت کی را اور افغانستان کی این ڈی ایس اس میں پیش پیش ہے۔ لیکن اہم امر یہ ہے کہ جب تک ہمارے اندر کے لوگ ان کے آلہ کار نہ بنیں یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے اندر کے لوگ

اپنے فرقہ وارانہ مذہبی مقاصد کے لئے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ شب و روز یہاں دھماکے ہوتے ہیں۔ اب پاکستانی فوج نے آپریشن راہِ راست، راہِ نجات، ضربِ عضب اور ردالفساد کے ذریعے اس جن کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔

ہمارے بچے اس قومی مقصد میں پیچھے نہیں ہیں۔ اے پی ایس کے بچے قربان ہوئے۔ اعتزاز احسن نے سکول بچانے کے لیے جان قربان کی۔ ہمارے تمام بچے اسی جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ ابھی بھی لڑ رہے ہیں اور بڑے ہو کر اندرونی خطرات سے کماحقہ نبرد آزما ہوں گے اور کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

شعر نمبر6

منزل پر پہنچیں گے اِک دن، وہیں قیام کریں گے ہم
روک نہیں سکتی ہے ناصرؔ کوئی بھی دیوار ہمیں

مفہوم:

ناصر بشیر ہمیں منزل پر پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا، ہم وہاں پہنچ کر قیام کریں گے۔

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ ہماری منزل پرامن اور ترقی یافتہ پاکستان ہے۔ دہشت گردی، فرقہ واریت اور عسکریت پسندی سے پاک پاکستان۔ ہم یہ منزل حاصل کر کے دم لیں گے۔ یہ دہشت گرد اور عسکریت پسند، یہ را اور این ڈی ایس ہمیں یہ مقصد حاصل کرنے سے روک نہیں سکتیں۔ بہت جلد دہشت گردی کا مکمل خاتمہ ہو گا۔ براہِ راست، راہِ نجات اور ردالفساد کا پھل ہمیں ملے گا۔ پاکستان پھر سے پرامن، آگے بڑھتا ہوا، ترقی کرتا ہوا ملک بن جائے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

بدقسمتی سے پاکستان میں 9/11 کے بعد کے اثرات کے باعث دہشت گردی کی تیز لہر جاری ہے۔ ہمارے اندر کے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی نے ہماری قومی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں کے مذہبی رجحانات میں بہت تضاد ہے۔ ان تضادات کو غیر ملکی ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں۔ اور پاکستان میں بدامنی پھیلا کر اسے غیر مستحکم کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ بھارت کی را اور افغانستان کی این ڈی ایس اس میں پیش پیش ہے۔ لیکن اہم امر یہ ہے کہ جب تک ہمارے اندر کے لوگ ان کے آلہ کار نہ بنیں یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے اندر کے لوگ اپنے فرقہ وارانہ مذہبی مقاصد کے لئے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ شب و روز یہاں دھماکے ہوتے ہیں۔ اب پاکستانی فوج نے آپریشن راہِ راست، راہِ نجات، ضربِ عضب اور ردالفساد کے ذریعے اس جن کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔

ہمارے بچے اس قومی مقصد میں پیچھے نہیں ہیں۔ اے پی ایس کے بچے قربان ہوئے۔ اعتزاز احسن نے سکول بچانے کے لیے جان قربان کی۔ ہمارے تمام بچے اسی جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ ابھی بھی لڑ رہے ہیں اور بڑے ہو کر اندرونی خطرات سے کماحقہ نبرد آزما ہوں گے اور کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔